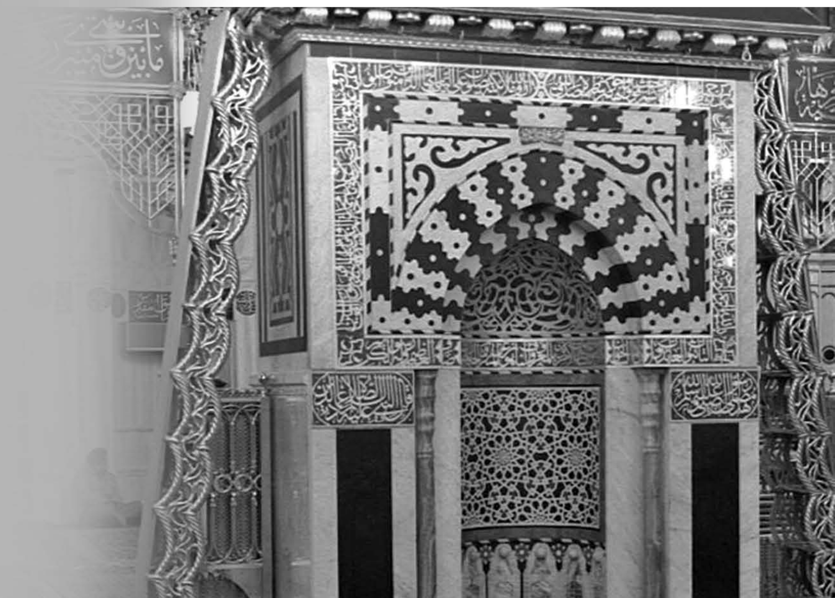
# سیرت رسول ﷺ کے عملی پہلو



امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

# فضائل اخلاق

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

## کتاب اللہ کی شہادت

رسول اللہ ﷺ عالم انسانیت کے لیے فضائل و مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ جس وجود مبارک کو پوری اولاد آدم کے لیے قیامت تک اسوہ حسنہ قرار دیا گیا۔ اس کی حیثیت اس کے سوا ہو بھی کیا سکتی تھی؟ اس کا پہلا شاہد قرآن پاک ہے۔

(۱) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾ (سورۃ قلم۔۴)

"(اے پیغمبر) تم اعلیٰ اخلاق پر پیدا ہوئے۔"

(۲) فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠

(آل عمران: ۱۵۹)

"(اے پیغمبر) خدا کی یہ بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے (یعنی ان کے دل تمہاری طرف اس طرح نہ کھنچتے جس طرح اب بے اختیار کھنچ رہے ہیں)"۔

(۳) لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (توبہ: ۱۲۸)

"(مسلمانو) تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے، جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بھوکا ہے۔ مومنوں کے لیے نہایت شفیق و رحیم ہے۔"

## حضور ﷺ کے ارشادات

حضور ﷺ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔

"میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔"

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

"میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کا معاملہ درجہ ءاتمام پر پہنچادوں"۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی تھی تو انھوں نے اپنے بھائی کو تحقیق احوال کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا۔ بھائی نے مکہ مکرمہ سے مراجعت پر ابوذر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں اطلاع دی:

رایتہ یامر بمکارم الاخلاق [1]

"میں نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے۔ آپ ﷺ اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔"

یہ بعثت کے بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ اس دور میں بھی جس کسی کی نظر آپ ﷺ پر پڑی، آپ ﷺ میں جو نمایاں ترین وصف نظر آیا، اسے فضائل اخلاق ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

## حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان

امام حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کے اخلاق وعادات کے متعلق سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

آپ ﷺ خندہ جبیں، نرم خو اور مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگدل نہ تھے۔ کوئی برا کلمہ کبھی منہ سے نہ نکلا۔ عیب جُو اور تنگ گیر نہ تھے۔ کوئی بات ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے۔ اپنے نفس سے آپ ﷺ نے تین چیزیں بالکل دور کر دی تھیں: (الف) بحث و مباحثہ، (ب) ضرورت سے زیادہ بات کرنا (ج) جو بات مطلب کی نہ ہو، اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین ہی باتوں سے پرہیز کرتے تھے: (الف) کسی کو برا نہیں کہتے تھے (ب) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے (ج) کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا۔ آپ ﷺ کلام کرتے تو صحابہ اس طرح سر جھکا کر اور خاموش ہو کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جب آپ ﷺ خاموش ہو جاتے تو پھر (صحابہؓ) آپس میں بات چیت کرتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک ختم نہ کرلیتا آپ ﷺ چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے، آپ ﷺ محض مسکرا دیتے۔ باہر کا کوئی آدمی (یعنی اجنبی) بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ ﷺ تحمل فرماتے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اگر کوئی آپ ﷺ کے احسان وانعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرمالیتے۔ جب تک بولنے والا چپ نہیں ہو جاتا تھا، آپ ﷺ اس کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست

---

[1] بخاری کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخا

گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی آپ ﷺ کو دفعتہ دیکھ لیتا تو مرعوب ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا محبت کرنے لگتا۔ ❶ اور کہا کرتا کہ میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی بھی اس سے پہلے یا بعد میں نہیں دیکھا۔ یہ محض عہد نبوت کے تئیس برس ہی نہیں بلکہ چند سال پیشتر کے عینی مشاہدات کا بھی جامع مرقع ہے۔

## حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعض اہم واقعات بھی دیکھے تھے اور مدنی زندگی میں تو وہ حضور ﷺ کی رفیقہ حیات بن گئی تھیں۔ یہاں تک کہ اس دنیا میں حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا آخری ہفتہ حضرت ممدوحہ ؓ ہی کے حجرے میں گزرا۔ حضرت ممدوحہ رضی اللہ عنہا نے سہارا دے رکھا تھا، جب روح پاک اس دنیا کو چھوڑ کر عالم قدس میں پہنچی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے حجرے کو اللہ تعالیٰ نے جسد اطہر کی آخری آرام گاہ بنایا۔ مشاہدے کے جیسے مختلف مواقع حضرت ممدوحہ رضی اللہ عنہا کو میسر آئے، وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعض ارشادات ملاحظہ ہوں:

۱۔ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں سے وہ لے لیتے جو آسان اور سہل ہوتی، بشرطیکہ اس میں گناہ کا کوئی پہلو نہ ہوتا، اگر گناہ ہوتا تو آپ ﷺ سب سے بڑھ کر اس سے دوری اختیار کرتے۔ ❷

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی کو سزا نہ دی اور کبھی بدلہ نہ لیا۔ ہاں اللہ کے حکموں کی حرمت زایل کرنے والوں کو آپ ﷺ اللہ کے لیے سزا دیتے تھے۔ ❸

۳۔ عادت شریف یہ تھی کہ برائی کے بدلے میں برائی سے کبھی کام نہ لیا۔ ہمیشہ درگزر کرتے اور معاف فرمادیتے۔ ❹

۴۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح کبھی نہ ہنسے کہ آپ ﷺ کا تالو نظر آیا ہو، صرف مسکرادیا کرتے تھے۔

۵۔ ہر لحظہ دل پر خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ رہتا تھا، بادل دیکھتے یا آندھی آتی تو چہرہ مبارک پر تکلیف کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ میں نے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے) کہا: یارسول اللہ! لوگ بادل دیکھتے ہیں تو

---

❶ سیرت النبی جلد اول حصہ دوم ص۲۸۹-۲۸۸ بحوالہ شمائل ترمذی
❷ صحیح بخاری، کتاب المناقب
❸ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص۲۸۷
❹ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص۲۸۷

اس امید پر خوش ہوتے ہیں کہ بارش ہو گی۔ آپ ﷺ کے چہرے سے تکلیف نمایاں ہوتی ہے۔ فرمایا: عائشہؓ! کون سی بات مجھے بے خوف کر سکتی ہے کہ اس میں عذاب نہ ہو گا؟ ایک قوم کو آندھی سے عذاب دیا گیا۔ ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہا یہ بادل ہے۔ ❶

۶۔ آپ ﷺ نے نام لے کر کبھی کسی پر لعنت نہ کی، نہ کبھی اپنے کسی خادم، کسی لونڈی، کسی غلام، کسی عورت اور کسی جانور کو اپنے ہاتھ سے مارا۔ ❷

۷۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کی درخواست رد نہ فرمائی، اِلا یہ کہ وہ ناجائز تھی۔

۸۔ گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے، باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔ ❸

۹۔ ایک بدوی آیا اور بولا آپ ﷺ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں ہم تو بوسہ نہیں دیتے، فرمایا: اللہ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا، اس میں میرا کیا اختیار ہے؟ ❹

۱۰۔ اسود رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: گھر والوں کی خدمت میں رہتے تھے یعنی ان کے کام کیا کرتے تھے، نماز کا وقت آتا تو نماز کے لیے چلے جاتے۔ ❺

۱۱۔ اگر کسی کی کوئی حرکت پسند نہ ہوتی تو اس کا نام لے کر منع نہ فرماتے، اصل فعل کو منع فرمادیتے۔

۱۲۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں نے ایک دن میں دو نوالے نہیں کھائے، مگر ان میں سے ایک کھجور کا تھا۔ ❻

اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے خادم انس رضی اللہ عنہ بن مالک کا یہ بیان بھی شامل کر لیجیے کہ میں نے دس سال آپ ﷺ کی خدمت میں گزارے، اس پوری مدت میں آپ ﷺ میرے متعلق ناپسند کا کوئی کلمہ زبان پر نہ لائے۔ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں کیا؟ نہ کبھی یہ فرمایا: فلاں کام کیوں نہ کیا؟ ❼

## نبوت سے پیشتر کی زندگی

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیانات کا تعلق زیادہ تر عہد نبوت سے ہے جس کی کل

---

❶ صحیح بخاری

❷ سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۳۸۷ بحوالہ مسلم وابوداؤد۔

❸ بخاری کتاب الادب۔

❹ بخاری، کتاب الادب

❺ بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب اذا دعی الامام الی الصلوٰۃ۔

❻ صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔

❼ بخاری، کتاب الادب۔

مد تیئیس سال تھی۔ اس سے پیشتر آپ ﷺ چالیس سال کی طویل مدت گزار چکے تھے۔ یہی زندگی ہے جسے قرآن مجید میں ایک مقام پر صداقت نبوت کی ایک قوی دلیل قرار دیا گیا ہے یعنی !

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس:١٦)

"یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے (یعنی نبوت) سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں۔"

مشرکین عرب کو رسول اللہ ﷺ کی صداقت و فضیلت سے انکار نہ تھا، حتیٰ کہ ابو جہل کو بھی اعتراف تھا کہ آپ ﷺ سچے ہیں، مگر وہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں ہم قبول نہیں کر سکتے۔ اوپر کی آیت میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے۔ یعنی فرمایا:

"ساری باتیں چھوڑ دو، ایسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں نیا آدمی نہیں، جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور دیانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا اب ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا پر بہتان باندھنے کیلئے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی چھوٹی سی بات بھی تم نہیں سمجھ پاسکتے؟

تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔ جو سانچا اس عرصے میں بن گیا بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں ہی پر نہیں، فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (الانعام۔١٤) پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ بعد میں فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے کہ جو شخص اللہ پر افترا کرے، اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر مفتری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے، ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا

کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔ [1]

دنیا جانتی ہے کہ جس دور میں سچائی اور دیانت و امانت کی روشنی گل ہو چکی تھی، اس دور میں رسول اللہ ﷺ نے سیرۃ طیبہ کی پاکیزگی اور طہارت سے "الصادق اور الامین" کے لقب حاصل کیے۔ جب حرم کعبہ کی تعمیر کے سلسلے میں حجر اسود کو اصل مقام پر نصب کرنے کے متعلق رؤساء قبائل کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی تو فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے، اسے ثالث بنا لیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے آئے اور تمام لوگ پکار اٹھے: "امین آگئے"۔ "امین آگئے"، ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے۔ یہ حضور ﷺ کی سیرت کے متعلق ایک ایسی گواہی تھی، جس کی صداقت و حکمیت سے کسی کے لیے بھی اختلاف بجا نہ ہو گا۔

## حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شہادت

محض یہی نہیں، ایک نہایت زبردست شہادت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ہے، جو بعثت تک پندرہ سال رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں گزار چکی تھیں۔ اس کے بعد دین حق کے دور غربت کی اذیتیں اور مصیبتیں بھی دس سال تک صابرانہ برداشت کر کے عالم بقا کو سدھاریں۔ یہ شہادت بھی عہد بعثت سے نہیں بلکہ بعثت سے پیشتر ہی کی زندگی سے متعلق ہے۔

سورہ علق کی آیتیں آپ ﷺ پر نازل ہو چکیں تو اول نزول وحی کی شدت کا آپ ﷺ پر بے حد اثر تھا اور یہ پہلی وحی تھی، معلوم ہے کہ اس کے بعد بھی جب وحی نازل ہوتی تھی تو چہرہ مبارک پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے تھے۔ دوم جو گراں قدر کام اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذمے لگا دیا تھا، اس کی بے پناہ مشکلات کا آپ ﷺ کو پورا اندازہ تھا، اس لیے آپ ﷺ وہ حرا سے اتر کر گھر تشریف لائے تو قلب مبارک پر لرزہ سا طاری تھا۔ جب طبیعت ذرا سکون پذیر ہوئی تو آپ ﷺ نے پوری کیفیت غمخوار و غمگسار رفیقہ حیات کو سنا کر فرمایا: لقد خشیت علیٰ نفسی (مجھے اپنی جان کا خوف ہے)۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے نہایت پاکیزہ اور سراپا خیر طریق حیات سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ انہیں خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ خلق خدا کے ساتھ محبت و شفقت کے ایسے نادر پیکر کو قدرت کامیابی کی منزل پر نہ پہنچائے گی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

"ہرگز نہیں، خدا کی قسم، خدا آپ ﷺ کو کبھی اندوہ گیں نہ کرے گا۔ آپ ﷺ عزیزوں اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں۔ ناتوانوں، بیکسوں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ جن کے پاس

---

[1] ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۵۱۔ ۱۵۲۔

کچھ نہیں ہوتا، انہیں دیتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ مصائب میں حق کے معاون و مددگار ہیں۔ [1] صادق القول ہیں۔ [2]"

یہ شہادت ان فضائل و مکارم کے متعلق ہے جو بعثت سے پیشتر وجود گرامی میں موجود تھے اور حضرت خدیجہؓ سے بڑھ کر ان کا اندازہ شناس کون ہو سکتا تھا؟

## اہل ایمان کے اوصاف و خصائل

رسول اللہ ﷺ کے فضائل اخلاق کا اندازہ کرنے کے لیے ایک معیار یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان کے جو اوصاف و خصائل قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں انہیں سامنے رکھ لیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس وجود مبارک کے ذریعے سے قرآن مجید کی تعلیم مخلوق تک پہنچائی، وہ بہر حال اس تعلیم کا ایک مقدس پیکر ہو گا۔ اسی وجود مبارک کو دیکھ کر صحابہ اپنے عمل درست کرتے تھے اور اسی وجود مبارک کے زیر سایہ ان کے تزکیہ کا سلسلہ جاری تھا۔

قرآن مجید سے وہ تمام آیتیں اس مختصر مضمون میں چن کر جمع کر دینا ممکن نہیں، لیکن ان میں سے چند ملاحظہ فرمالیجیے، جن میں مجلسی، اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے اوصاف کا ذکر ہے:

۱۔ مومن وہ ہیں جو اللہ سے ڈرتے اور باہمی معاملات درست رکھتے ہیں۔ اللہ کا ذکر چھڑے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اللہ کا کلام سنایا جائے تو ان کے ایمان زیادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں، جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہی حقیقی مومن ہیں (انفال:۱۔۴)

۲۔ بلاشبہ ایمان والے کامیاب ہوئے (ان کی خصوصیتیں کیا ہیں؟) نمازیں خشوع و خضوع سے ادا کرتے ہیں۔ نکمی اور لغو باتوں سے رُخ پھیرے ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں۔ عفت و عصمت کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے امانتوں اور وعدوں کا انہیں پاس رہتا ہے۔ نمازوں کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ (مومنون:۱ – ۱۰)

۳۔ اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں یعنی عجز و فروتنی سے چلتے ہیں۔ جب جاہل یعنی کم عقل، اکھڑ اور بے ادب لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو ملایم بات سنا کر اور صاحب سلامت کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ رات کا وقت (یعنی سونے کا وقت کلب کی تفریحات میں نہیں) اپنے پروردگار کے لیے قیام اور سجود میں گزارتے ہیں اور کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم سے دوزخ کا عذاب

---

[1] کیف کان بدالوحی

[2] یہ ٹکڑا اسی حدیث کی روایت میں آیا ہے جو بخاری کی کتاب التعبیر میں آئی ہے۔

پھیر دے جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ موقع کی مناسبت کے پیش نظر تنگی کرتے ہیں ۔وہ کسی کا بے گناہ خون نہیں بہاتے جس سے اللہ نے منع کر رکھا ہے اور بدکاری سے بھی دور رہتے ہیں جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے۔ کسی کی لغویات سے گزر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں۔(فرقان: ۶۳-۷۴)

۴۔ "وہ (اہل ایمان) پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے دور رہتے ہیں۔ جب غصّہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں اور خدا نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جب ان پر کوئی زیادتی ہو تو بدلا لیتے ہیں، برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے، اس کا ثواب اللہ کے ذمّے ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا، جو کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے اور جو ظلم سہہ جائے اور معاف کر دے تو یہ بڑی اعلیٰ ہمّتی کے کاموں میں سے ہے"۔(شوریٰ ۳۶:۴۳)

## اصل نیکی

### اصل نیکی کیا ہے؟

۱۔ اللہ پر ایمان۔
۲۔ یوم آخرت اور فرشتوں پر ایمان۔
۳۔ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں اور خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان۔
۴۔ خدا کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مانگنے والوں کو دینا۔
۵۔ مال خرچ کر کے غلاموں کو آزادی دلانا۔
۶۔ نماز اور زکواۃ باقائدہ ادا کرتے رہنا۔
۷۔ عہد کر لینا تو اسے بہر حال پورا کرنا۔
۸۔ تنگی، مصیبت یا خوف و ہراس میں صابر و ثابت قدم رہنا۔(بقرہ: ۱۷۷)

نیز فرمایا:

۱۔ خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں خدا کے لیے خرچ کرنا۔
۲۔ غصّے کو پی جانا اور لوگوں کے قصور معاف کر دینا۔

یہ دعوت حق کی محض چند جھلکیاں ہیں جنھیں ان پر عمل کرنے والوں کی شکل میں بھی پیش کیا گیا اور محض نیکیوں کی شکل میں بھی۔ کیا کسی کے لیے یہ تصور کر لینا مشکل ہے کہ جس داعی حق کو یہ پاک دعوت

دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا، وہ خود اپنی مقدس تعلیم کا کتنا افضل و اعلیٰ اور کس درجہ منور و مزکّی نمونہ ہو گا۔

## حسنِ اخلاق کی اہمیت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

۲۔ کامل ایمان اس مومن کا ہے، جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔

۳۔ قیامت کے روز اعمال کی ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری چیز کوئی نہ ہو گی۔

۴۔ انسانوں کو قدرت کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان میں سب سے بہتر چیز اچھے اخلاق ہیں۔

۵۔ بندوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

۶۔ آخرت کی زندگی میں میرے لیے سب سے پسندیدہ وہ شخص ہو گا جس کے اخلاق اچھے ہوں اور وہی مجھ سے قریب تر ہو گا۔ [1]

۷۔ کسی نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ مومنوں میں سے افضل کون ہے ؟ فرمایا: ”احسنهم خلقا“ (جو سب سے زیادہ خوش اخلاق ہو) [2]

۸۔ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ حاصل کر سکتا ہے، جو مسلسل روزے رکھنے اور راتوں کو مسلسل عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

آخری ارشاد کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ یہ ایک اسلوب بیان ہے، جس میں حسن اخلاق کو اس درجے پر رکھ کر پیش کیا گیا ہے جو نماز اور روزے جیسی نفلی عبادات سے حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص فضائل اخلاق کے ساتھ نفلی عبادت میں بھی سرگرم رہے گا، اس کا درجہ اور بھی بلند ہو گا۔

غرض ان ارشادات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فضائل اخلاق کو دین حق میں کتنا بلند درجہ حاصل ہے اور ہونا بھی چاہئیے، کیونکہ اخلاق درست ہوں گے تو افراد و جماعات میں میل جول بڑھے گا۔ ان میں محبت و ہمدردی کو فروغ حاصل ہو گا۔

ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور دکھ سکھ کا احساس ترقی کرے گا۔ کش مکش کے اسباب رفتہ رفتہ زائل ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ پورا مجمع انسانیت ایک کنبے کے افراد اور ایک خاندان کے اعضا کی حیثیت میں رہنے سہنے لگے گا۔ ہر قلب میں احترام آدمیت کو صحیح مقام مل جائے گا۔ یہی اسلام کا اصل نصب العین تھا۔ اس کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ اچانک ملوکیتوں اور بادشاہیوں کا دور شروع ہو گیا،

---

[1] سیرۃ النبی جلد ششم ص ۲۰۔ ۲۲

[2] سیرۃ ابن ہشام، القسم الثانی ص ۳۶۱۔

جس کی ظلمت و تیر گی میں قافلہ اسلام کی ہر متاعِ عزیز گم ہو گئی اور اب کسی بھی چیز کا ٹھیک سراغ لگالینا خاصا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر کسی کا سراغ مل بھی جائے تو ہم لوگوں کے ذہنوں میں دور ملوکیت کے وقت سے دین حق کا جو نقشہ جما ہوا ہے، اس میں کسی بازیافتہ شے کے لیے موزوں جگہ نکالنا بظاہر آسان نہ ہو گا۔

باقی رہی تبلیغ اسلام تو وہ ہر مسلمان کے لئے فرداً فرداً اور ہر اسلامی جماعت کے لئے اجتماعاً اس دنیا میں اولین شے ہے، نہ محض اس لیے کہ اسلام اور حق کو پھیلانا ہر فرد و جماعت کے لیے بہترین سعادت ہے، اس لیے بھی کہ ہم جنسوں کی پُر خلوص بہی خواہی ہر مسلمان کے اہم فرائض میں داخل ہے اور تمام ہم جنسوں کو نعمت اسلام کا حامل بنا دینے سے بڑھ کر بہی خواہی کوئی نہیں ہو سکتی، جس پر دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و بہبود موقوف ہے۔ لیکن تبلیغ اسلام کے لیے بھی ساز گار فضا صلح و امن ہی سے میسر آسکتی ہے۔؛ اگر نفرت و مخالفت کی آگ دلوں میں بھڑک رہی ہو تو کسی کو پیغام حق سنانے کی کیا صورت ہو گی؟ سیرۃ طیبہ سے ظاہر ہے کہ بدر و حنین کی فتوحات بے شائبہ ریب بہت عظیم القدر تھیں تاہم فتح مبین صلح حدیبیہ ہی قرار پائی، جس نے طول و عرض عرب میں دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول دیے اور "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا روح افروز منظر سب نے دیکھ لیا۔

## ایمان کیا ہے؟

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں سے صرف چند حدیثیں یہاں درج کی جاتی ہیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ ایمان و اسلام حقیقۃً کیا ہیں؟ مثلاً:

۱۔ مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان کو کوئی گزند نہ پہنچے اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی ہر شے ترک کر دے۔

۲۔ اس وقت تک کوئی شخص حقیقۃً مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اپنے مومن بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کی حلاوت پالی۔

الف۔ اللہ اور رسول ﷺ اس کے نزدیک ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں۔

ب۔ ہر فرد کے ساتھ صرف اللہ کے لیے محبت کرے یعنی محبت کے ساتھ کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔

ج۔ کفر کی طرف لوٹ جانا اسے اتنا ہی بُرا معلوم ہو، جتنا آگ میں ڈالا جانا۔

۴۔ تین باتیں ہیں، جس نے یہ جمع کر لیں، اس نے ایمان جمع کر لیا۔

الف۔ اپنے نفس کے مقابلے میں بھی انصاف پر قائم و استوار رہنا۔
ب۔ دنیا میں سلامتی اور حق پھیلانا۔
ج۔ تنگ دستی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

۵۔ حضور ﷺ سے پُوچھا گیا کہ کون سا اسلام بہتر (خیر) ہے۔ فرمایا: کھانا کھلانا اور سب کو سلام کہنا یعنی سلامتی کی دُعا دینا، خواہ جان پہچان ہو یا نہ ہو۔

۶۔ خود ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری کی روایت ہے کہ میں نے غلام کو گالی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے سُن لی اور فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ ابھی تم میں جاہلیت باقی ہے، غلام تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے، جس کا بھائی ماتحت ہو، اسے چاہیے بھائی کو ویسا ہی کھلائے جیسا آپ کھائے، ویسا ہی پہنائے جیسا آپ پہنے اور بھائی سے ایسا کام نہ لے، جو اس سے نہ ہو سکے، کوئی سخت کام ہو تو خود اس کی مدد کرے۔

۷۔ جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ وہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو، وہ دل ہے۔

۸۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔

۹۔ جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ مقابلے پر آئیں تو قاتل و مقتول دونوں آگ میں ہوں گے۔ عرض کیا گیا: کہ قاتل تو ہوا مگر مقتول کا یہ حال کیوں ہو گا؟ فرمایا: وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنا چاہتا تھا (لیکن موقع نہ پا سکا اور خود مارا گیا)۔

۱۰۔ جس میں چار باتیں ہوں، وہ خالص منافق ہے:
الف۔ امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔
ب۔ بات کہے تو جھوٹ بولے۔
ج۔ عہد کرے تو اسے پورا نہ کرے۔
د۔ جھگڑے تو ناحق کی طرف چلا جائے۔
ان میں سے کوئی بھی بات کسی میں ہو تو نفاق کی علامت ہو گی تا آنکہ وہ اسے ترک کر دے۔

۱۱۔ خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل وہ ہے، جس پر مداومت کی جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔

۱۲۔ "کتاب الادب" میں ہے کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا:
خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا۔ عرض کیا: کون یا رسول اللہ ﷺ ؟
فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔

ان ارشادات پر غور فرمایئے اور اندازہ کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے عالم انسانیت کو کس راستے پر چلنے کی دعوت دی؟

آیا اس کے سوا امن عالم اور بہبودِ انسانیت کا کوئی راستہ ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی سوچئے کہ جس سرچشمہ فلاح و صلاح کونین سے یہ اور ایسی ہزاروں موجیں اٹھیں، اس کے طیب و طاہر ہونے کا درجہ کتنا بلند ہو گا۔

## دائرۂ اصلاح و درستی

قرآن پاک اور سنت رسول ﷺ میں جو کچھ بصورت امر یا بہ شکل نہی آگیا ہے، اس میں انسانی زندگی کا کوئی بھی ضروری گوشہ نظر انداز نہیں ہوا۔ خطبہ حج میں رسول اللہ ﷺ نے تین چیزوں کا ذکر بطور خاص فرمایا تھا، یعنی جان، مال اور آبرو، پھر حج کے دن، حج کے مہینے اور مکہ مکرمہ کی حرمت کی طرح جان، مال اور آبرو کی عزت و حرمت کی تاکید فرمائی تھی۔ غور کیا جائے، تو دنیا میں جتنی زیادتیاں، جتنے ظلم اور جتنے گناہ ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق اصلاً انھی تین چیزوں میں سے کسی ایک سے نکلے گا جو ہر انسان کو فطرۃً عزیز ہیں۔ کتاب و سنت کی محولہ بالا تعلیمات میں کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی، جو ضروری تھی اور اس کے کرنے یا نہ کرنے کی تاکید نہ آئی ہو۔

## حُسن خلق

رسول اللہ ﷺ نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ چہرہ مبارک پر اس قسم کی کیفیت چھائی رہتی تھی جس سے دیکھنے والے پر لطف و شفقت کا اثر پڑتا۔ گفتگو وقار و متانت سے فرماتے، ایک ایک جملہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے۔ ہر ایک کو نرمی سے سمجھاتے۔ کبھی کسی کی دل شکنی گوارا نہ فرمائی، آپ سوار ہوتے اور راستے میں کوئی صحابی مل جاتا تو اسے سوار کرا دیتے اور خود اتر آتے۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا تو ڈھیلے مار مار کر کھجوریں گراتا۔ لوگ مجھے پکڑ کر خدمت اقدس میں لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجور کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارا کرو، پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

ایک مرتبہ حالتِ قحط میں ایک صاحب نے باغ سے کھجور کے خوشے توڑ کر کھائے اور کچھ دامن میں رکھ لیے۔ باغ کے مالک نے اسے مارا اور کپڑے اتروا لیے، پھر شکایت لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا۔ کھجوریں توڑنے والا بھی ساتھ تھا۔ آپ ﷺ نے مالک باغ سے کہا۔ یہ جاہل تھا، اسے تعلیم دینی چاہیے تھی۔ بھوکا تھا، کھانا کھلانا چاہیے تھا۔ یہ فرما کر کپڑے واپس دلائے اور اسے ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے دیا،

جو ہمارے حساب سے تین من، تیرہ سیر اور دو چھٹانک ہوتا ہے۔

مجلس نبوی ﷺ میں بیٹھنے کی جگہ نہ رہتی تو نئے آنے والے کے لیے ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔ سلام میں پیش دستی فرماتے۔ راستہ چلتے تو مرد، عورت، بچہ جو سامنے آتا اسے سلام کرتے۔ زبان مبارک پر کبھی کوئی غیر مناسب لفظ نہ آیا۔ انس رضی اللہ عنہ بن مالک کہتے ہیں کہ جب، کسی پر عتاب کرتے تو فرماتے: "مالهٔ تَرِب جبینه" اسے کیا ہوا، اس کی پیشانی خاک آلود ہو)[1] محاورے میں اس فقرے کا استعمال ہلکے زجر کے رنگ میں ہوتا ہے۔

## بچوں پر شفقت

حضور ﷺ بچوں پر بہت شفقت فرماتے۔ آپ ﷺ سفر سے تشریف لاتے اور لوگ استقبال کے لیے نکلتے تو بچے بھی ساتھ ہوتے اور وہ معمول کے مطابق دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے، جو پہلے پہنچتے انہیں آپ ﷺ ساتھ سواری پر بٹھا لیتے۔ راستے میں مل جاتے تو انھیں خود سلام کرتے اور ان سے بھی شفقت کا یہی برتاؤ ہوتا۔

ایک مرتبہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی۔ اس کی دو بچیاں بھی ساتھ تھیں۔ اتفاق سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا۔ ایک کھجور پڑی تھی وہ اس عورت کو نذر کر دی۔ اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ایک ٹکڑا دونوں کو دے دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کو سنایا تو فرمایا: جس کے دل میں خدا اولاد کی محبت ڈالے اور وہ اس محبت کا حق ادا کرے تو دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

یہ شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی۔ ایک دفعہ کسی غزوے میں چند بچے بھی بے ارادہ و علم مارے گئے، آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو بڑا رنج ہوا۔ کسی کی زبان سے نکلا یا رسول اللہ ﷺ وہ مشرکین کے بچے تھے۔ فرمایا: مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ بن سمرہ صحابی اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی پھر آپ ﷺ کے ساتھ ہو لیا۔ سامنے سے چند اور بچے آ گئے۔ آپ ﷺ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔

## غلاموں پر شفقت

اوپر گزر چکا ہے، ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں '

---

[1] بخاری: کتاب الادب۔

جو خود کھاؤ، انہیں کھلاؤ، جو خود پہنو، انہیں پہناؤ۔ چنانچہ اس کے بعد سے ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو ہمیشہ کھانے پہننے وغیرہ میں اپنے برابر رکھا۔

غلاموں کے لئے لفظ غلام بھی گوارانہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں غلام یالونڈی کہہ کر نہ پکارا کرو۔ "میرا بچہ" "میری بچی" کہا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو غلام آتا، اسے آزاد کر دیتے۔ لیکن وہ لوگ آزاد ہو کر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کی زنجیر میں جکڑے رہتے۔ زید رضی اللہ عنہ بن حارث کا واقعہ محتاج تفصیل نہیں۔ ان کے والد اور چچا لینے کے لیے آئے اور ہر قیمت ادا کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی زید رضی اللہ عنہ کو آزاد کر چکے تھے۔ جانے نہ جانے کا معاملہ زید رضی اللہ عنہ ہی پر چھوڑ دیا۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ رحمت کو والدین اور دوسرے خونی اقرباکے ظل عاطفت پر ترجیح دی [1]۔ محبت و شفقت کے اس اعجاز کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے، جس کے سامنے قریب ترین خونی رشتے بھی بے حقیقت رہ گئے تھے؟ زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنی محبت تھی، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ بعض نہایت اہم معاملات میں اسامہ رضی اللہ عنہ ہی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سفارشی بنایا جاتا تھا اور فتح مکہ میں داخلے کے وقت اسامہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ردیف تھے۔

ایک صحابی اپنے غلام کو مار رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی کہ خدا کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔ صحابی نے مڑ کر دیکھا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اسے لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔ فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتش دوزخ تمہیں چھولیتی۔

سب سے آخری وصایا میں سے ایک وصیت یہ تھی کہ غلاموں اور لونڈیوں کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہنا۔ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں کا قصور کتنی مرتبہ معاف کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ جب تیسری مرتبہ یہی گزارش کی تو فرمایا: "ہر روز ستر مرتبہ"۔

## غریبوں پر شفقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا یہ کیوں؟ فرمایا: اس لیئے کہ مساکین دولتمندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ پھر فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا! کسی مسکین کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ کچھ نہ ہو تو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی سہی، ضرور دے دو۔ عائشہ رضی اللہ عنہا غریبوں سے محبت کرو۔ انہیں اپنے سے نزدیک رکھو، خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں مسجد میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف فقرائے

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول حصہ دوم ص ۳۸۲۔

مہاجرین کا حلقہ تھا۔رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس حلقے میں بیٹھ گئے۔میں بھی وہیں جا بیٹھا۔ فرمایا: فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولتمندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں جائیں گے۔

فرمایا: جو شخص کسی بیوہ اور مسکین کی خبر گیری کرتا ہے۔اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کی ہے یا اس شخص کی جو دن کو روزے رکھتا ہے اور رات کو عبادت کے لئے کھڑا رہتا ہے۔ [1]

عوالی میں ایک بڑھیا بیمار تھی، اس کے جانبر ہونے کی امید نہ تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب اس کی وفات ہو تو مجھے ضرور خبر کرنا۔ میں جنازے کی نماز پڑھاؤں گا۔ اتفاق سے بڑھیا کا انتقال کچھ رات گئے ہوا۔ صحابہ نے آپ ﷺ کو رات کے وقت اٹھانا گوارا نہ کیا اور بڑھیا کو دفن کر دیا۔ صبح کے وقت آپ ﷺ نے دریافت فرمایا اور پوری کیفیت معلوم ہوئی تو اس خاتون کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔

ایک مرتبہ ایک قبیلہ مسافروار مدینہ منورہ آیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ کسی کے بدن پر ثابت کپڑا نہ تھا، پاؤں ننگے تھے۔ کھالیں بدن پر بندھی ہوئی تھیں اور تلواریں گلوں میں ڈال رکھی تھیں۔ حضور ﷺ کی نظر مبارک ان لوگوں کی خستگی پر پڑی تو چہرہ انور کا رنگ بدل گیا۔ حالت اضطراب میں اندر تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے اور بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز کے بعد ایک خطبے میں سب کو ان غریبوں کی امداد پر آمادہ کر دیا۔

شفقت ورافت عامہ کے باب میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ عبادات نافلہ چھپ کر ادا فرماتے تاکہ عام لوگوں کے لئے آپ ﷺ کی پیروی میں اس قدر عبادت کرنا شاق نہ ہو۔

## مساوات

مساوات کی جیسی عملی مثالیں رسول اللہ ﷺ کی سیرۃ طیبہ میں ملتی ہیں، ویسی اور کہاں ملیں گی؟ اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے آزاد کردہ غلام زید رضی اللہ عنہ بن حارث کی شادی اپنی پھپھیری بہن سے کر دی تاکہ اونچ نیچ کے فرضی اور خود ساختہ سانچے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اس کے مندرجہ الفاظ پر غور فرمائیں:

"اے گروہ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔

یہ مساوات کا محض درس ووعظ ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سب سے بڑی، موثر اور ناقابل تردید دلیل بھی تھی۔ دنیا کے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ آدم ہی سب کے مورث اعلیٰ تھے۔ اگر ایک گھرانے کے تمام ارکان درجے میں یکساں ہوتے ہیں تو پھر آدم علیہ السلام کی اولاد میں چھوٹے، بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، آقا غلام کی

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب۔

تفریق کس بنا پر جائز سمجھی جاسکتی ہے؟ خون، رنگ، نسل، دولت وغیرہ کے امتیازات ان لوگوں نے پیدا کیے، جن کے ہاتھ سے حقیقت کا رشتہ نکل چکا تھا اور جو ہوسناکیوں کی بنا پر انسانیت کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہوگئے تھے۔ اللہ کے نزدیک انسانوں میں مراتب کا انحصار حسن عمل پر ہے۔ جس کے پاس عمل کا اندوختہ زیادہ ہوگا، وہ خدا کے نزدیک سب پر فایق ہوگا، اگرچہ کالا اور مفلس ہو۔ وہ لوگ اس سے نیچے رہیں گے جو حسن عمل میں اس کے برابر نہ ہونگے، خواہ ان کے رنگ کتنے ہی گورے اور ان کی دولت و ثروت کتنی ہی لاانتہا ہی ہو۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں زید رضی اللہ عنہ، اسامہ رضی اللہ عنہ، بلال رضی اللہ عنہ یا دوسرے مساکین کا درجہ عباس رضی اللہ عنہ سے کم نہ تھا جو آپ ﷺ کے چچا تھے۔ جنگ بدر میں وہ قید ہو کر آئے تو انصار نے اس بنا پر ان کا زر خرید معاف کر دینا چاہا کہ عباس رضی اللہ عنہ کے والد رشتے میں انصار کے بھانجے تھے مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں، ایک دام بھی معاف نہ کرو۔

آپ ﷺ مسجد کی تعمیر میں صحابہ کے ساتھ برابر کام کرتے رہے۔ خندق کی کھدائی میں بھی آپ ﷺ نے برابر حصہ لیا۔ سفر میں صحابہ کھانا پکانے کا کام مل جل کر کرتے۔ آپ ﷺ بھی کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمے لے لیتے۔ ایک مرتبہ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں لانے کا کام آپ ﷺ نے سنبھالا۔ فدائیوں نے عرض کیا کہ یہ کام ہم کرلیں گے۔ فرمایا: "میں پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو تم سے ممتاز رکھوں۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو ہمراہیوں میں ممتاز بنے۔"

جنگ بدر کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے نکلے تو سواریوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ تین تین کے حصے میں آیا، باری باری ہر فرد سوار تھا۔ حضور ﷺ کے بھی دو ساتھی تھے، وہ عرض کرتے کہ آپ ﷺ سوار رہیں۔ ہم پیدل چلیں گے۔ فرمایا: نہ میں چلنے میں تم سے کم طاقت ور ہوں اور نہ ثواب کے لیے میں تم سے کم محتاج ہوں۔

مشہور واقعہ ہے کہ بنی مخزوم میں سے ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی بعض لوگ اسے چھڑانا چاہتے تھے اور اس غرض سے اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سفارشی بنا کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کی درخواست سنی تو فرمایا: کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو؟ پھر خطبہ دیا، جس میں ارشاد ہوا: پہلی امتیں صرف اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جرم کا مرتکب ہوتا تو اس سے چشم پوشی کی جاتی، کوئی معمولی آدمی پکڑا جاتا تو اسے سزا دلاتے۔ اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو اسے بھی قطع ید کی سزا ضرور دی جاتی۔

## ایثار

اخلاق و عادات شریفہ میں ایثار کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے یعنی دوسروں کو اپنی ذات بلکہ اعزہ

پر بھی ہر معاملے میں مقدم رکھنا۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو حضرت فاطمہ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا سے جس قدر محبت تھی اس کا بیان مشکل ہے۔ جب آپؓ ملاقات کے لیے تشریف لاتیں تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی پر بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے اور عموماً پوچھتے کوئی خاص کام تو نہیں؟

ایک مرتبہ کسی غزوے میں کچھ کنیزیں آئیں۔رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم انھیں تقسیم فرما رہے تھے۔ حضرت فاطمہ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا کو بھی ایک خادمہ کی سخت ضرورت تھی کیونکہ عسرت کے باعث کوئی ملازمہ نہ تھی اور گھر کا سارا کام حضرت فاطمہ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا خود ہی انجام دیتیں، چکی پیستیں، پانی کی مشک بھر لاتیں۔ اس وجہ سے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے اور جسم مبارک پر نیل کے نشان نظر آتے تھے۔ سیدہ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا عالم حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں پہنچیں۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے معمول کے مطابق پوچھا، کوئی کام ہے؟ سیدہ عالم رَضِیَ اللہُ عَنْہَا حیا و خود داری کے باعث کچھ نہ کہہ سکیں: حضرت علی رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے ان کی ترجمانی کی۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوا۔ جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے، میں دوسری طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ ایک روایت میں ہے حضرت زبیر رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کی صاحبزادیاں بھی ایسی ہی درخواست لے کر آئی تھیں۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔

ایک دفعہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو چادر تحفے میں ملی، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ضرورت تھی، رکھ لی۔ ایک صاحب حاضر خدمت ہوئے اور کہا، کیا اچھی چادر ہے۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اتار کر ان صاحب کو دے دی۔ وہ لے کر چلے تو لوگوں نے ملامت کی کہ تم جانتے تھے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو چادر کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا میں نے تو اس لیے لے لی کہ اسی چادر کا کفن بناؤں گا اور یہ میرے لیے باعث برکت ہو گا۔

ایک صحابی کے پاس ولیمے کے لیے کچھ نہ تھا۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: عائشہ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا کے ہاں جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ جا کر لے آئے حالانکہ شام کو حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ہاں کھانے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اسی طرح ایک غفاری کی مہمانداری کے لئے بکری کا دودھ تھا جو خود پی کر رات گزارتے تھے۔ دودھ مہمانوں کو پلا دیا اور خود رات فاقے سے گزاری۔

ایثار کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ اطمینان و راحت کا مقام ہو تو دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ خطرے اور تحمل شدائد کا مقام ہو تو انسان خود آگے رہے اور دوسروں کو پیچھے رکھے، یہ دونوں پہلو سیرۃ طیبہ میں جابجا نمایاں ہیں۔

## سوال اور گداگری سے کراہت

سوال اور گداگری انسانی کردار کے لئے بے حد مضر ہے۔ اس سے احساس خودداری رفتہ رفتہ ماؤف

ہو جاتا ہے۔ انسان تن آسان بن جاتا ہے۔ غیرت و حمیت کا آئینہ بے طرح مکدر ہو جاتا ہے۔ محنت و مشقت سے کسب حلال کے بجائے عجز و الحاح سے مانگنے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں میں عزائم امور کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی والہیت باقی نہیں رہتی۔ جس قوم کے افراد عزائم کی لذت سے ناآشنا ہو جائیں، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بامقصد زندگی کی لذت وصورت سے محروم ہو گئی۔ معذور یا واقعی ضرورت مند افراد کا معاملہ الگ ہے لیکن جو لوگ گداگری کو پیشہ بنا لیتے ہیں وہ پورے معاشرے کے لیے باعث ننگ و عار بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے گداگری کے انسداد پر بھی خاص توجہ فرمائی۔

ایک مرتبہ ایک انصاری نے سوال کیا۔ فرمایا: تمہارے پاس کچھ ہے؟۔ ایک بچھونے اور پیالے کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے دونوں چیزیں منگوائیں اور دو درم میں فروخت کر دیں۔ پھر فرمایا: ایک درم سے گھر میں کھانے کی جنس دے آؤ۔ دوسری سے رسی وغیرہ خرید کر جنگل میں نکل جاؤ اور لکڑیاں لا کر بیچو۔ پندرہ روز کے بعد وہ انصاری آئے تو ان کے پاس دس درہم تھے۔ کچھ کپڑا اور غلہ خریدا اور اسی طرح ایک بے کار آدمی معاشرے کا نہایت فعال رکن بن گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ اچھا ہے یا یہ کہ اپنے چہرے پر گدائی کا داغ لگا کر روزِ قیامت حاضر ہوتے؟

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر جائے اور لکڑیوں کا گٹھا پشت پر اٹھا کر لائے اور فروخت کرے اور یوں اللہ اس کی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے، وہ اسے دیں یا نہ دیں"[1] ا

حکیم رضی اللہ عنہ بن حزام کا اپنا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مانگا۔ آپ نے دے دیا۔ پھر مانگا، دے دیا اور فرمایا:

"حکیم! یہ مال ہرا بھرا اور میٹھا ہے جو اسے سخاوت نفس کے ساتھ لے گا، اسے برکت ہو گی۔ جو نفس کی طمع سے لے گا، اسے برکت نہ ہو گی۔ اس کی کیفیت اس شخص کی سی ہو گی جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا"۔

الید العلیا خیرٌ من السفلیٰ۔

"اونچا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔"

حکیم رضی اللہ عنہ نے پھر عمر بھر کسی سے کچھ نہ مانگا۔[1]

پھر فرمایا:

"مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے پیچھے پھرے۔ کہیں سے ایک لقمہ یا دو لقمے یا ایک کھجور، دو کھجوریں

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (توبہ-٦٠)

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ۔

مل جائیں تو دوسرے دروازے پر چلا جائے۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال نہیں کہ ضروریات سے بے نیاز کر دے۔ نہ کوئی اس کا حال جانتا ہے کہ صدقہ دے۔ نہ وہ اٹھ کر لوگوں سے کچھ مانگتا ہے"[2]۔

ایک موقع پر تین چیزوں کو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دیا:

قیل وقال و اضاعۃ المال و کثرۃ السوال

"فضول باتیں، مال ضائع کرنا اور زیادہ مانگنا۔[3]"

یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اللہ سے دعا کرے کہ اسے سوالی و گداگری کی ذلت سے بچایا جائے تو اللہ بچا دیتا ہے۔ جو خدا اسے غنا کا طلب گار ہو، اللہ اسے غنا مرحمت فرماتا ہے۔ جو شخص صبر کرتا ہے اللہ اسے اور دیتا ہے اور صبر سے بہتر و وسیع تر دولت کوئی نہیں جو کسی کو دی گئی ہو۔

## جود و سخا

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

کان النبی ﷺ اجود الناس و اجود مایکون فی رمضان[4]

رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور آپ ﷺ کی سخاوت کا ظہور سب سے بڑھ کر رمضان شریف میں ہوتا تھا۔

حدیث ہے کہ:

مَاسُئِلَ النبی ﷺ عن شَیءٍ قط فقال لا[5]

"رسول اللہ ﷺ سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی گئی کہ آپ ﷺ نے جواب میں "لا" یعنی کلمہ نفی فرمایا ہو"۔

ایک مرتبہ کسی نے کچھ مانگا۔ فرمایا: "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، تم میرے ساتھ آؤ۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا: جب آپ ﷺ کے پاس کچھ نہیں تو آپ ﷺ پر کیا ذمہ داری ہے۔ ایک اور صاحب بھی تھے، وہ بولے یا رسول اللہ ﷺ! آپ دیتے جائیں۔ عرش والا خدا آپ ﷺ کو محتاج نہ کرے گا۔ یہ سن کر آپ ﷺ فرط بشاشت سے مسکرا دیئے۔

ایک مرتبہ کوئی چار اوقیہ چاندی نذر کر گیا۔ تین اوقیے تو تین ضرورت مندوں کو دے دیے۔ چوتھا

---

[2] ایضاً ایضاً باب من سال الناس تکثر

[3] ایضاً ایضاً۔

[4] بخاری: کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا

[5] ایضاً ایضاً۔

لینے والا کوئی نہ آیا۔ رات کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند نہیں آتی۔ کبھی اٹھتے ہیں اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ذرا لیٹ کر اٹھتے ہیں اور نماز شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام کیوں نہیں فرماتے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا مجھے ڈر ہے۔ مبادا یہ میرے پاس ہو اور موت آجائے۔

ایک مرتبہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ فرمایا: ابوذر رضی اللہ عنہ، اگر کوہ احد میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک بھی دینار باقی ہو، بجز اس رقم کے جو ادائے قرض کے لیے رکھ چھوڑوں۔ [1]

احد بہت بڑا پہاڑ ہے۔ وہ سونے کا بن جائے تو اسے ایک دن میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم تین دن ضرور لگیں گے، ساتھ ہی قرض ادا کرنے کی اہمیت بھی واضح فرما دی اور ارشاد گرامی سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیاضی اور سخاوت کے باعث مقروض رہتے تھے۔ کوئی چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آجاتی تو جب تک تقسیم نہ فرما دیتے مضطرب رہتے۔ ایسے متعدد واقعات کتب حدیث میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ جامع ارشاد پیش نظر رکھ لیجئے۔

ماترك رسول الله صلى الله عليه وسلم دينارا أو درهما ولا شاة ولا بعيرا ولا اوطى بشيئ۔

"رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (دنیا سے رحلت کے وقت) کوئی دینار اور کوئی درہم اور کوئی بکری یا کوئی اونٹ نہ چھوڑا اور نہ کسی شے کے لیے وصیت فرمائی"۔

جب باقی ہی کچھ نہ رہا تو وصیت کی کیا صورت تھی؟

## سادگی اور بے تکلفی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ سادگی اور بے تکلفی میں گزری۔ کسی قسم کے لوازم امارت و غنا اپنے گرد جمع نہ کیے۔ لباس، بستر، کھانا غرض ہر چیز عمر بھر بہت سادہ رہی۔ چٹائی، معمولی فرش یا زمین پر بیٹھنے میں کبھی تکلف محسوس نہ ہوا۔ عدی رضی اللہ عنہ بن حاتم بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو چمڑے کا ایک گدا تھا جس میں کھجور کی پتی بھری ہوئی تھی، وہی عدی رضی اللہ عنہ کی طرف کھسکا دیا، خود زمین پر بیٹھ گئے۔ عدی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو گدے پر بیٹھنا خلاف ادب سمجھا۔ چنانچہ دوران گفتگو میں گدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عدی رضی اللہ عنہ کے درمیان پڑا رہا۔ فرمایا کرتے تھے، گھر میں ایک بستر اپنے لیے، ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان

---

[1] سیرۃ النبی بحوالہ صحیح مسلم۔

کے لیے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے۔ [1]

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے جو مکان بنوائے تھے وہ دس دس بارہ بارہ فٹ کے کچے حجرے تھے، جن میں سے بعض کی دیواریں کچی تھیں اور بعض کے لیے کھجور کی ٹہنیاں کھڑی کر کے اوپر سے لپائی کر دی گئی تھی۔ کھجور کی شاخوں کی چھتیں تھیں۔ اونچائی اتنی کہ آدمی کھڑا ہو کر ہاتھ اوپر اٹھائے تو چھت کو جا لگے۔ عبدالملک اموی کے عہد میں توسیع مسجد نبوی ﷺ کے لیے ان حجروں کو منہدم کرانا ضروری سمجھا گیا تو اہل مدینہ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ یہ حجرے محفوظ رکھے جاتے تاکہ دنیا دیکھتی کہ رسول اللہ ﷺ نے روئے زمین پر کس سادگی، بے تکلفی اور زہد و قناعت میں دن گزارے۔

ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں کھانے کے لیے بلایا گیا۔ دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ دیواروں پر پردے لٹک رہے ہیں، باہر ہی سے واپس ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مراجعت کا سبب پوچھا تو فرمایا: پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ زیب و زینت والے کسی مکان میں داخل ہو۔ اسی قسم کا واقعہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی پیش آیا۔ آپ ﷺ کسی غزوے کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مکان کی چھت کے ساتھ ایک کپڑا باندہ دیا۔ واپس تشریف لائے اور چھت میں بندھا ہوا کپڑا دیکھا تو اسے اُتار دیا۔ فرمایا: خدا نے ہمیں اس لیے دولت نہیں دی کہ اینٹوں اور پتھروں کو کپڑے پہنائیں۔

ایک مرتبہ کسی نے کمخواب کی قبا ہدیتہ بھیجی۔ آپ ﷺ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی۔ پھر اتار کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دی۔ وہ روتے ہوئے آئے کہ جو چیز آپ ﷺ نے ناپسند فرمائی، وہ مجھے عطا کی، فرمایا: پہننے کے لیے نہیں فروخت کر دینے کے لیے بھیجی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دو ہزار درہم میں فروخت کر دیا۔

## صبر و حلم

صبر و حلم اور عفو و درگزر کے باب میں صرف اسی امر کا اعادہ کافی ہے کہ آپ ﷺ نے عمر بھر کسی سے ذاتی بدلا نہ لیا سب کو معاف فرماتے رہے۔

ایک یہودی کے آپ ﷺ مقروض تھے۔ اگرچہ ادائے قرض کے وعدے میں تین روز باقی تھے، مگر یہودی ہمیشہ سے سرمایہ پرست چلے آ رہے ہیں۔ تین روز پہلے ہی آ کر متقاضی ہوا بلکہ حضور ﷺ کے عفو و حلم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ گزرا کہ عبدالمطلب کے خاندان کے لوگ بڑے ناہند ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس وقت موجود تھے، انھوں نے یہودی کو سختی سے جھڑک دیا۔ رسول اللہ ﷺ

---

[1] سیرۃ النبی بحوالہ داؤد۔

مسکرائے اور فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ تمہیں لازم تھا کہ میرے ساتھ اور اس شخص کے ساتھ اور طرح کا برتاؤ کرتے، مجھے حسن ادا کے لیے کہتے اور اسے حسن تقاضا سکھاتے۔ پھر یہ فرماتے ہوئے کہ اگرچہ وعدہ پورا ہونے میں ابھی تین روز باقی ہیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کا قرض ابھی ادا کردو اور بیس صاع [1] جنس زیادہ دینا کیونکہ تم نے اسے سختی سے ڈانٹا تھا۔

رؤسائے طائف نے دعوت اسلام کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سلوک کیا تھا، وہ بیان ہو چکا ہے۔ اوباشوں کو برانگیختہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسوائے۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پہاڑوں کا فرشتہ میرے پاس آیا جی حکم ہو تو دونوں طرف کے پہاڑ ان پر الٹ دوں۔ فرمایا: نہیں مجھے امید ہے ان کے اخلاف میں سے وہ لوگ اٹھیں گے جو خدائے واحد کو مانیں گے۔

غزوہ احد میں دندان مبارک ٹوٹ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے۔ مگر یہی دعا فرمائی کہ اے خدا میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا، وہ حقیقت حال سے ناآشنا ہیں۔

خطبہ حج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام جاہلیت کے خون اور قرضے ختم کر دیے تو سب سے پہلا اپنے خاندان کا خون اور اپنے خاندان میں سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قرضہ ختم کیا۔

## عام خصائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن معاملہ، عدل و انصاف، مہمان نوازی کے معیار قایم کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شرم و حیا، عزم و استقلال اور شجاعت کا پیکر تھے۔ عائلی زندگی کا بہترین نمونہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا اور ازواج رضی اللہ عنہن سے اچھے برتاؤ کے بارے میں بار بار تاکید فرمائی۔ فرمایا: تم میں سے بہتر وہ ہے جو اہل خانہ کے لیے بہتر ہے۔ چرند و پرند سب پر شفقت فرماتے۔ دوسروں کے کام کر دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے اور اس میں ادنیٰ اعلیٰ کی کوئی تمیز نہ تھی۔ کسی کا بھی احسان لینا گوارا نہ تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر جاں نثاری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ جن کے لیے فرمایا کہ ان کے مال اور صحبت کا میں سب سے زیادہ ممنون ہوں۔ تاہم ہجرت کے موقع پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جو ناقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پالی تھی، وہ نذر کرنی چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمت دے کر خریدی۔ مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زمین مالک اور ان کے سرپرست ہبہ کر دینے پر اصرار کرتے رہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمت دے کر لی۔

ادائے عبادات میں بھی سہولت عامہ بطور خاص ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کے

---

[1] قاضی سلیمان مرحوم فرماتے ہیں کہ صاع ہمارے ہاں کے اوزان کے مطابق دو سیر ساڑھے تین چھٹانک کا ہوتا ہے۔ یہی واقعہ یہودی کے اسلام کا باعث بنا۔ اس نے نبی موعود کے حکم کے مطابق جو کچھ سن رکھا تھا اس کی آزمائش کے لیے یہ حرکت کی تھی۔

متعلق معلوم ہوا کہ وہ نماز فجر میں لمبی سورتیں پڑھتے ہیں تو فرمایا: تم میں سے جو نماز پڑھائے مختصر پڑھائے کیونکہ مقتدیوں میں بوڑھے، ضعیف اور کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ زیادہ مدح وستائش بھی پسند نہ تھی۔ آپ ﷺ وضو فرماتے تو صحابہ دست مبارک سے گرنے والے پانی کو چلو میں لے کر برکت کے لیے بدن پر مل لیتے۔ پوچھا ایسا کیوں کر رہے ہیں ۔ عرض کیا خدا و رسول ﷺ کی محبت میں ، فرمایا: اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہے تو چاہیے کہ جب وہ بات کرے، سچ بولے، جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو اس کا حق ادا کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو حق ہمسایگی اچھی طرح نباہے۔

## بعض اہم ارشادات

آپ ﷺ کے بعض اہم ارشادات یہاں درج کیے جاتے ہیں، جن سے اسلام کی تعلیم اور خود حضور ﷺ کی عملی زندگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ "تم میں سے جب کوئی شخص کسی کو مال اور صورت میں برتر و افضل دیکھے تو چاہیے کہ اس کی طرف بھی دیکھ لے جو دیکھنے والے سے کمتر اور نیچے ہے"۔ [1]

(دیکھیے افضل و برتر دیکھنے سے دل میں حسد پیدا ہوگا جو گوناگون برائیوں کا سرچشمہ ہے، کمتر شخص کو دیکھنے سے شکر کا جذبہ ابھرے گا جو نیکیوں کا وسیلہ ہے۔)

۲۔ "تو مسلمانوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح دیکھے گا، جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے پورا جسم بے خوابی اور بخار کے ساتھ پکارتا ہے"۔ [2]

سعدی نے اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

چو عضوے بہ درد آورد روزگار دگر عضوہا رانہ ماند قرار

۳۔ "جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیئے کہ یا تو اچھی بات کہے یا چپ رہے"۔ [3]

۴۔ "آپس میں بغض نہ رکھو، حسد نہ کرو، باہم تعلقات نہ توڑو اور اللہ کے بندو، بھائی بھائی ہو جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے"۔ [4]

۵۔ "سچائی اور راست بازی نیکی کی طرف لے جاتی ہے، اور نیکی جنت میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر سچ

---

[1] بخاری: کتاب الرقاق، باب لینظر الی من ہو اسفل منہ۔
[2] بخاری: کتاب الادب، باب رحمۃ الناس۔
[3] بخاری: کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ۔
[4] بخاری ایضاً باب ما ینھی عن التحاسد

بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ صدیق ہو جاتا ہے (اسی طرح) جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے، برائی آگ میں پہنچاتی ہے۔ انسان برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے"۔ ❶

٦۔ "شہ زوری دوسرے کو پچھاڑنا نہیں، شہ زور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے"۔ ❷

کسی فارسی شاعر نے ہمارے عہد کی حالت کا نقشہ کیا خوب کھینچا۔

دستے کہ عنان خویش گیر دامروز بہ آستین کس نیست۔

٧۔ " راست روی اختیار کرو، باہم محبت بڑھاؤ اور لوگوں کو خدا کی طرف سے بشارت پہنچاؤ، تنہا عمل تو کسی کو بھی جنت میں نہ لے جائے گا"۔ ❸

٨۔ "جو شہرت کے لیے کام کرے گا، اللہ اسے فضیحت دے گا، جو ریا کے لیے کام کرے گا اللہ اس کی اصل حقیقت لوگوں کو دکھادے گا"۔ ❹

٩۔ "خبردار! بدگمانی کو اپنی عبادت نہ بنانا، بدگمانی تو جھوٹ ہے، بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ، دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو، آپس میں بغض نہ رکھو"۔ ❺

١٠۔ "اسیروں کو رہائی دلاؤ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، بیماروں کی عیادت کرو"۔

١١۔ "لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، انھیں تنگی اور سختی میں نہ ڈالو، خوشخبری اور بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ، مل جل کر رہو"۔

١٢۔ "دو نعمتیں ہیں، جن کی قدر اکثر لوگ نہیں جانتے: اول تندرستی دوم فراخدستی"۔

١٣۔ "تم میں سے کوئی موت کی خواہش نہ کرے، نیک آدمی تو اس لیے کہ شاید وہ اور نیک کام کرے اور بد اس لیے کہ شاید وہ معافی مانگ لے"۔ ❻

## پانچ مذموم خصلتیں

"پانچ مذموم خصلتیں ایسی ہیں کہ جب وہ تم پر نازل ہوں تو میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ خصلتیں تم لوگ اختیار کرو:

---

❶ ایضاً باب ماینھی عن الکذب
❷ بخاری: ایضاً باب الحذر من الغضب
❸ بخاری: کتاب الرقاق، باب القصد والمداۃ علی العمل۔
❹ بخاری، ایضاً باب الریاواس معۃ۔
❺ رحمۃ اللعلمین ص ٣٥٣ بحوالہ بخاری۔
❻ کتاب المرضیٰ باب تمنی المریض الموت۔

۱۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم میں فواحش کا ظہور اس حد پر پہنچ گیا ہو کہ لوگ علانیہ ان کا ارتکاب کرنے لگیں اور اس قوم میں طاعون اور ان بیماریوں کا ظہور نہ ہوا ہو، جو ان کے باپ دادا میں موجود نہ تھیں۔

۲۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے ناپ اور تول میں کمی شروع کی ہو اور اس قوم کو قحط سالی، گرانی، سخت محنت و مشقت اور حکمرانوں کے ظلم وجود نے گرفت میں نہ لیا ہو۔

۳۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اپنے اموال میں سے زکوٰۃ دینا بند کیا ہو اور اسے آسمان سے ہونیوالی بارش سے محروم نہ کر دیا گیا ہو، اگر بہائم نہ ہوں تو بارش بالکل روک دی جائے۔

۴۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اللہ اور اس کے رسول کا عہد توڑا ہو اور اس پر اغیار کو دشمن بنا کر مسلط نہ کر دیا گیا ہو اور وہ اس قوم کے اموال کا ایک حصہ نہ چھین لیں۔

۵۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم کے پیشواؤں اور رہنماؤں نے کتاب اللہ کے مطابق حکومت سے اعراض کر کے خدائی احکام کے خلاف زبردستی اپنے احکام نافذ کرنا شروع کیے ہوں اور اللہ نے اس قوم کے اندر جدال و قتال اور دشواریاں نہ پیدا کی ہوں"۔ [1]

## نور حق کے لیے والہیّت

قرآن مجید میں جابجا اسلام کو نور کہا گیا ہے یعنی حق کی روشنی، مثلاً:

۱۔ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۔ (اعراف:۱۵۷)

"پیروی کی اس نور کی جو اس کے (رسول اللہ ﷺ کے) ساتھ اترا۔"

۲۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ (زمر: ۲۲)

"بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے اسلام کے لیے سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے۔"

۳۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۔ (بقرہ:۲۵۷)

"اللہ ان کا ساتھی اور مددگار ہے، جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں انہیں تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے۔"

بعض مقامات پر "نور" اس طرح آیا ہے کہ بعض مفسرین کرام کو خیال ہوا غالباً اس سے مراد خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔ جیسے سورہ مائدہ میں ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۝۱۵ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ۔ (مائدہ ۱۵۔۱۶)

"اللہ کی طرف سے تمہارے پاس "نور" (رسول اللہ ﷺ یا حق کی روشنی) آچکا نیز وہ روشن

---

[1] سیرۃ ابن ہشام القسم الثانی ص ۶۳۱

کتاب آچکی جس کے ذریعے سے اللہ اپنی رضا و خوشنودی کے پیروں کو سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت دیتا ہے۔"

مندرجہ ذیل دعا سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کے قلب منور میں "نور حق" کے لیے کس درجہ والہیت اور شیفتگی تھی اور یہ دعا آپ ﷺ روزانہ پڑھتے تھے۔

اللّٰھُمَّ فِی قلبی نوراً وَّ فی بصری نوراً وَّ فی سمعی نوراً وَّ عن یمینی نوراً وَّ عن یساری نوراً وَّ فوقی نوراً وَّ تحتی نوراً وَّ امامی نوراً وَّ خلفی نوراً وَّ اجعل لی نوراً وَّ فی لسانی نوراً وَّ فی دمی نوراً وَّ فی عصبی نوراً وَّ فی شعری نوراً وَّ فی بشری نوراً۔ اللّٰھُمّ اعطنی نوراً، اللّٰھُمَ اعظم لی نوراً، اللّٰھم اجعلنی نوراً۔

"الٰہی! میرے قلب میں نور ہو اور میری آنکھوں میں نور ہو اور میرے کانوں میں نور ہو، اور میرے داہنے نور ہو، میرے بائیں نور ہو، میرے اوپر نور ہو اور میرے نیچے نور ہو اور میرے آگے نور ہو اور میرے پیچھے نور ہو اور نور میرا بنادے اور میری زبان میں نور ہو، میرے خون میں نور ہو اور میرے پٹھوں میں نور ہو اور میرے بالوں میں نور ہو، میرے چہرے پر نور ہو، الٰہیٰ مجھے نور عطا فرما، الٰہیٰ میرے نور کو بڑھا، الٰہیٰ مجھے نور ہی بنادے۔"

## سنت رسول پاک ﷺ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی سنت کے متعلق پوچھا۔ فرمایا:

| | |
|---|---|
| ۱۔المعرفۃ راس المالی | میری اصل پونجی معرفت ہے۔ |
| ۲۔والعقل اصل دینی | عقل سلیم میرے دین کی اصل ہے۔ |
| ۳۔و الحبّ اساسی | محبت میری بنیاد ہے۔ |
| ۴۔والشوق مرکبی | شوق میری سواری ہے۔ |
| ۵۔والذّکر انیسی | اللہ کا ذکر میرا انیس و مونس ہے۔ |
| ۶۔والثّقۃ کنزی | اعتماد الٰہیٰ میرا خزانہ ہے۔ |
| ۷۔والحزن رفیقی | (ہم جنسوں کی فلاح کے لیے اندوہ قلب میرا رفیق ہے) |
| ۸۔والعلم سلاحی | علم میرا ہتھیار ہے۔ |
| ۹۔والصبر ردائی | صبر میری رداہے۔ |
| ۱۰۔والرضاغنیمتی | رضائے باری تعالیٰ میری غنیمت ہے۔ |
| ۱۱۔والعجزفخری | عاجزی میرا سرمایہ فخر ہے۔ |
| ۱۲۔والزھد حرفتی | زہد میرا پیشہ ہے۔ |

۱۳۔والیقین قُوتی یقین میری روزی ہے۔
۱۴۔والصدق شفیعی راست بازی اور صداقت میری شفیع یعنی ساتھی ہے۔
۱۵۔والطاعتہ حسبی طاعت حق میری عزت ہے۔
۱۶۔والجہاد خلقی جہاد یعنی راہ حق میں انتہائی سعی وجہد میری جبلی ہے۔ خصلت
۱۷۔وقرۃ عینی فی الصلوٰۃ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

کیا تاریخ عالم کی کسی شخصیت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس میں خصائل جمیلہ اور شمائل حسنہ اس پیمانے پر جمع ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی ذات بابرکات میں بہ درجہ کمال جمع کر دیے تھے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی دوسری شخصیت کی ایک ایک خصوصیت، ایک ایک حرکت، ایک ایک عمل اور ایک ایک ارشاد مستند روایات کی بناء پر آج تک اس طرح محفوظ بھی نہیں ہوا، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے متعلق ایک ایک چیز جمع ہوئی۔ صدق اللہ عزوجل۔

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ (الرعد۔۱۷)

"پس جھاگ تو خشک ہو کر جاتا رہتا ہے (کیونکہ وہ کسی کام نہ تھا) اور جس میں بندگان خدا کے لیے نفع ہو، وہ چیزیں زمین میں باقی رہتی ہے۔"

# رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (الانبیاء۔۱۰۷)

## نوعِ اِنسانی کے لیے رحمت

یہاں پیغمبر اسلام کے ظہور کا ایک ایسا وصف بیان کیا گیا ہے جو قرآن کے بیان کردہ اوصاف میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ [1] یعنی رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ! یہ ظہور کسی ایک ملک، کسی ایک قوم، کسی ایک نسل ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہے۔ یہ وصف بیان کرکے قرآن نے ایک کسوٹی ہمارے حوالے کردی ہے۔ اس پر ہم اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکھ لے سکتے ہیں۔ اگر یہ فی الحقیقت تمام نوع انسانی کے لیے رحمت کا ظہور ثابت ہُوا ہے تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو پھر سچائی نے قرآن کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارا فرض ہے کہ حقیقت کا اعتراف حقیقت کے لیے کرلیں۔

یہ جانچ تاریخ کی بے لاگ اور بے رحم جانچ ہونی چاہیے۔ ہر طرح کی مذہبی خوش اعتقادیوں سے منزہ، ہر طرح کی خودپرستانہ طرف داریوں سے پاک، کیونکہ یہاں حقیقت کی عدالت موجود ہے اور وہ صرف حقیقت ہی کی شہادت پر کان دھرتی ہے۔

## تاریخ کا فیصلہ

جہل و تعصب نے ہمیشہ اعلان حقیقت کی راہ روکنی چاہی ہے، لیکن روک نہیں سکی۔ اس کے فیصلے میں بھی تاریخ نے دیر لگائی، لیکن بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑا، ضروری ہے کہ فیصلہ خود اسی کی زبانی سُنا جائے اور ایک معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک مورخ کی طرح عالم انسانیت کے ایک ایک گوشے سے شہادت طلب

---

[1] وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ
”اور اے پیغمبر ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ پوری کائنات کے لیے رحمت کا ظہور ہو۔“

کی جائے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی، جو اس موضوع پر عملی حیثیت سے وقیع سمجھی جا سکے۔ ہم نے "مقدمہ تفسیر" میں اس کی کوشش کی ہے اور ایک خاص باب کا موضوع بحث یہی مسئلہ ہے۔ یہاں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں، اس لیے مجبوراً قلم روک لینا پڑتا ہے۔ (سورۂ انبیا کا حاشیہ)

## ابر رحمت اور شادابی زمین

جب زمین پیاسی ہوتی ہے تو ربّ السمٰوٰت والارض پانی برساتا ہے، جب انسان اپنی غذا کے لیے بے قرار ہوتا ہے تو وہ موسم ربیع کو بھیج دیتا ہے، جب خشک سالی کے آثار چھا جاتے ہیں تو آسمان پر رحمت کی بدلیاں پھیل جاتی ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (روم:۴۸)

"وہ خدا ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور ہوائیں بادلوں کو اپنی جگہ سے ابھارتی ہیں اور جس طرح اس کی مرضی نے انتظام کر دیا ہے، بادل فضا میں پھیل جاتے ہیں، پس تم دیکھتے ہو کہ ان کے اندر سے مینہ برسنے لگتا ہے اور تمام زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے پھر جب وہ اپنے بندوں پر جو بارش سے مایوس ہو گئے تھے، پانی برسا دیتا ہے، تو وہ کامیاب و خرم ہو کر خوشیاں منانے لگتے ہیں"۔

## قدرتی مثالوں کی حکمت

خدا کی تمام مثالیں اور دانائیاں جو وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کھولتا ہے، ہمیشہ عام اور قدرتی مناظر سے تعلق رکھتی ہیں تاکہ زمین کی ہر مخلوق ان کی تصدیق کر سکے اور ان سے دانائی حاصل کر سکے۔ وہ ایسے تغیرات و حوادث اور غیر فطری و صناعی چیزوں کا ذکر نہیں کرتے جن کو دیکھنے سمجھنے کے لیئے کسی خاص طرح کی زندگی، خاص طرح کے علم اور خاص طرح کے گرد و پیش کی ضرورت ہو، بلکہ اِس کی ہر تعلیم ایسی عام اور خالص فطری حالات سے متعلق ہوتی ہے، جس کو سن کر جنگل کا ایک چرواہا اور متمدن آبادیوں کا فیلسوف دونوں یکساں اثر کے ساتھ خدا کی سچائی کو پا سکتے ہیں۔ پس اگر تم نے فلسفہ و حکمت نہیں پڑھا، اگر تم نے اجرام سماویہ کے دیکھنے کے لیے کسی رصد خانے کی قیمتی دُور بین نہیں پائی، اگر تم کو مادہ کے خواص کا تجربہ نہیں، اگر تم کسی دارالعلوم کے اندر برسوں تک نہیں رہے، اگر تم صحرائی ہو، اگر تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر گوشہ نشین ہو، اگر پھونس کی ایک چھت اور بانسوں کی ایک شکستہ دیوار ہی رہنے اور بسنے کے لیے تمہارے حصے میں آئی ہے اور اس طرح تم نہیں جانتے کہ اپنے خدا کو آسمان کے عجیب و غریب

ستاروں کے اندر کیونکر دیکھو اور اس کے حسن و جمال کو عناصر و ذرات خلقت کی آمیزش و آویزش کے اندر کیونکر ڈھونڈو، تاہم تم انسان ہو، تم کو روح دی گئی ہے اور تم زمین پر بستے ہو، تم آسمان کی ہر بدلی کے اندر، بادلوں کے ہر ٹکڑے کے اندر، ہواؤں کے ہر جھونکے کے اندر، بارانِ رحمت کے ہر قطرے کے اندر، اپنے خداوند حی و قیوم کو، اس کی حکمت و قدرت کو، اس کی رافت و رحمت کو، اس کے پیار اور محبت کو دیکھ سکتے ہو اور اسے پا سکتے ہو۔ تم میں سے کون ہے جس نے امید و بیم کی نظروں سے کبھی آسمان کو نہیں دیکھا اور اس کی بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے اندر اپنی کھوئی ہوئی امید کو نہیں ڈھونڈا؟

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (روم:۲۴)

"اور قدرت الٰہی کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ جب زمین پیاسی ہوتی ہے اور خشک سالی کے آثار ہر طرف چھا جاتے ہیں تو وہ آسمان پر بارش کی علامتیں پیدا کر دیتا ہے اور تم امید و بیم کی نظروں سے انھیں دیکھتے ہو۔"

## موت کے بعد زندگی

پھر وہ کون ہے کہ جب تم اور تمہاری تشنہ و بیقرار زمین پانی کے ایک ایک قطرے کے لیے ترس جاتی ہے، خاک کا ایک ایک ذرہ رطوبت و نمو کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ کرہ ارضی اپنی بے خودانہ حرکت میں آفتاب کے آتش کدے سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اس کی تمام کائنات نباتات اپنا حسن و جمال فطری کھو دیتی ہے، پرندے اپنے گھونسلوں میں، ٹہنیاں درختوں میں اور انسان گھروں میں پانی کے لیے ماتم کرتا اور ہر دم آسمان کی گرم و خشک فضا کی طرف مایوسی کی نگاہیں اٹھاتا ہے تو وہ اپنی محبت و ربوبیت کے نقاب میں آتا ہے اور مایوسی کے بعد امید کا، نامرادی کے بعد مراد کا، موت کے بعد زندگی کا پیام زمین کے ایک ایک ذرہ تک پہنچا دیتا ہے۔

وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ (روم ۲۴)

"اس کی ربوبیت و رحمت کو دیکھو کہ جب تم امید و بیم کی نظروں سے آسمان کو دیکھتے ہو اور تمام زمین پر مردنی اور ہلاکی چھا جاتی ہے تو وہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور زمین پر موت کے بعد زندگی طاری ہو جاتی ہے۔ یقیناً قدرت الٰہی کی اس نمود میں صاحبان فکر و عقل کے لیے بڑی ہی نشانیاں رکھی گئی ہیں۔"

## روح کی پیاس اور دل کی بھوک

یہ وہ انتظام الٰہی ہے جو پروردگار عالم نے انسان کے جسم کی غذا کے لیے کیا ہے، پھر کیا اس نے انسان کی روح کے لیے کچھ نہ کیا ہو گا؟ وہ رب الارباب جو زمین کی پکار سن کر اسے پانی دیتا اور جسم کی بے قراری دیکھ کر

اسے غذا بخشتا ہے، کیا سرزمین روح و معنی کی تشنگی کے لیے کچھ نہیں رکھتا اور دل کی بھوک کے لیے اس کے خزانوں میں کوئی نعمت نہیں؟

وہ کہ اس کی محبت زمین کی مٹی کو خشک نہیں دیکھ سکتی اور درختوں کی ٹہنیوں کو وہ سبز پتوں اور سرخ پھولوں کی زیبائش سے محروم نہیں رکھتا، کیا روح انسانی کو ہلاکت و بربادی کے لیے چھوڑ دے گا اور عالم انسانیت کا مرجھا جانا اسے خوشی دے گا؟ وہ رب العٰلمین جو تمہارے جسم کو غذا دے کر موت سے بچاتا ہے' کیونکر ممکن ہے کہ تمہاری روح کو ہدایت دے کر ضلالت سے نہ بچائے؟

جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ اسلام سے پوچھا کہ:

فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ (طٰہٰ:۴۹)

"تمہارا پروردگار کون ہے، اے موسیٰ؟"

تو حضرت موسیٰؑ نے نہ صرف اپنے رب العٰلین کی نسبت خبر ہی دی، بلکہ اس کی الوہیت کی دلیل فطری و قطعی بھی چند لفظوں میں فرمادی:

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾ (طٰہٰ:۵۰)

"ہمارا رب وہ ہے جو "رب" ہے اور اس کے لیے اس کی ربوبیت نے کائنات کی ہر چیز کو اس کی خلقی ضروریات بخشیں، پھر اس کے بعد ان کی ہدایت کر دی تاکہ صحیح اور فطری طریقے پر کاربند رہ کر اپنی خلقت کے مقاصد حاصل کریں۔"

پس اس نے کہ زمین کی مٹی کے اندر قوت نشو و نما رکھی، پھر پانی برسا کر اس کی ہدایت کر دی، یعنی اس کے آگے نفوذ و عمل کی راہ کھول دی اور جس کی ربوبیت نے عالم ہستی کے ایک ایک ذرہ کے لیے خلقت اور ہدایت دونوں کا سامان کر دیا، انسان کو بھی جسم اور روح دونوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے لیے بھی خلقت اور ہدایت، دونوں کا سامان رکھتا ہے۔

## رحمت باری تعالیٰ کے خزانے

اس کی ربوبیت نے جس طرح جسم کے لیے زمین کے اندر طرح طرح کے خزانے رکھے ہیں، اسی طرح روح کی غذا سے بھی اس کے آسمانوں کی وسعت معمور ہے۔ جس طرح جسم کی غذا اور زمین کی مادی حیات و نمو کے لیے آسمانوں پر بدلیاں پھیلتیں، بجلیاں چمکتیں اور موسلا دھار پانی برستا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اقلیم روح و قلب کی فضا میں بھی تغیرات ہوتے ہیں۔ یہاں اگر زمین کی مٹی پانی کے لیے ترستی ہے، تو وہاں بھی انسانیت کی محرومی ہدایت کے لیے تڑپنے لگتی ہے، یہاں پتے جھڑتے ہیں، ٹہنیاں سُوکھنے لگتی ہیں اور پُھولوں کے رنگین ورق بکھر جاتے ہیں تو تم کہتے ہو کہ آسمان کو رحم کرنا چاہیے۔ وہاں بھی جب سچائی کا

درخت مُرجھا جاتا ہے، نیکی کی کھیتیاں سُوکھ جاتی ہیں، عدالت کا باغ ویران ہو جاتا ہے اور خدا کے کلمہ حق و صدق کا شجرہ طیّبہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر حصے میں بے برگ و بار نظر آنے لگتا ہے تو اس وقت رُوحِ انسانیت چیختی ہے کہ خدا کو رحم کرنا چاہیے۔ یہاں زمین پر موت طاری ہوتی ہے تو خدا کی بارش اسے پھر اٹھا کر بٹھا دیتی ہے:

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (اعراف: ۵۷)

"اور وہ پروردگار عالم ہی تو ہے کہ بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بارانِ رحمت کے آنے کی خوشخبری سنا دیتی ہیں، یہاں تک کہ جب اس کا وقت آ جاتا ہے تو وہ وزنی بادلوں کو حرکت دیتی ہیں اور ہم انہیں ایک ایسے شہر کے اوپر لے جا کر پھیلا دیتے ہیں جو ہلاک ہو چکا ہے اور زندگی کے لیے پیاسا ہے۔ پھر پانی برستا ہے اور زمین کی موت کو زندگی میں بدل دیتا ہے، اس کی نمو بخشی سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور مخلوقات اپنی غذا حاصل کر لیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم مردوں کو بھی اٹھاتے ہیں اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے سو دراصل ایک مثال ہے کہ تم دانائی اور سمجھ حاصل کرو۔"

## رحمت الٰہی کی عالمگیر نمود

عالم انسانیت کی فضائے روحانی کا ایک ایسا ہی انقلاب عظیم تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں ظاہر ہوا۔ وہ رحمت الٰہی کی بدلیوں کی ایک عالمگیر نمود تھی جس کے فیضان عام نے تمام کائنات ہستی کو سرسبزی و شادابی کی بشارت سنائی اور زمین کی خشک سالیوں اور محرومیوں کی بدحالی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ خداوند قدوس، جس نے سینا کی چوٹیوں پر کہا تھا کہ میں اپنی قدرت کی بدلیوں کے اندر آتشیں بجلیوں کے ساتھ آؤں گا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ میرے جاہ و جلال الٰہی کی نمود ہو گی، سو بالآخر وہ آ گیا اور سعیر و فاران کی چوٹیوں پر اس کے ابرِ کرم کی بُوندیں پڑنے لگیں۔

یہ ہدایت الٰہی کی تکمیل تھی، یہ شریعت ربانی کے ارتقاء کا مرتبہ آخری تھا، یہ سلسلہ ترسیل رسل و نزولِ رحمت کا اختتام تھا۔ یہ سعادت بشری کا آخری پیام تھا، یہ وراثت ارضی کی آخری بخشش تھی، یہ امت مسلمہ کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہ حضرت ختم المرسلین و رحمۃ للعلمین محمد بن عبد اللہ کی ولادت باسعادت تھی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہ وسلم۔

یہی واقعہ ولادت نبوی ہے جو دعوت اسلام کے ظہور کا پہلا دن تھا اور یہی ماہ ربیع الاول ہے، جس میں اس امت مسلمہ کی بنیاد پڑی، جسے تمام عالم کی ہدایت و سعادت کا منصب عطا ہونے والا تھا، یہ ریگستان حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن تھا، یہ عرب کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش نہ تھی، یہ محض قوموں کی

طاقتوں کا اعلان نہ تھا، اس میں صرف نسلوں اور ملکوں کی بزرگی کی دعوت نہ تھی جیسا کہ ہمیشہ ہُوا ہے اور جیسا کچھ کہ دنیا کی تمام تاریخ کا انتہائی سرمایہ ہے، بلکہ یہ عالم کی ربانی بادشاہت کا یوم میلاد تھا۔ یہ دنیا کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش تھی، یہ کرۂ ارضی کی سعادت کا ظہور تھا۔ یہ نوع انسانی کے شرف و احترام کا قیام عام تھا۔ یہ انسانوں کی بادشاہتوں، قوموں کی بڑائیوں اور ملکوں کی فتوحات کا نہیں بلکہ خدا کی ایک ہی اور عالمگیر بادشاہت کے عرش جلال و جبروت کی آخری اور دائمی نمود تھی۔ پس یہی دن سب سے بڑا ہے کیونکہ اسی دن کے اندر دنیا کی سب سے بڑی بڑائی ظاہر ہوئی۔ اس کی یاد نہ تو قوموں سے وابستہ ہے اور نہ نسلوں سے، بلکہ وہ تمام کرۂ ارضی کی ایک عام اور مشترک عظمت ہے جس کو وہ اس وقت تک نہیں بھلا سکتی، جب تک اسے سچائی اور نیکی کی ضرورت ہے اور جب تک اس کی زمین اپنی زندگی اور بقا کے لیے عدالت و صداقت کی محتاج ہے۔

## دنیا کی بڑائیاں اور ان کے نتیجے

دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ہوئے ہیں۔ یہ انقلابات خاص انسانوں کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان انسانوں کی پیدائش کے ایام کو بھی دنیا عظمت کے ساتھ یاد رکھنا چاہتی ہے اور اس اعتبار سے اس کی یادگاروں کی فہرست بڑی ہی طویل ہے۔ اس میں بادشاہوں کے زرنگار تختوں کی قطاریں ہیں۔ فاتحوں کی بے پناہ تلواروں کی جھنکار ہے۔ سپہ سالاروں کے زرہ بکتر کی ہیبت ہے۔ حکیموں کی حکمتوں اور دانائیوں کے دفاتر ہیں۔ فلاسفہ و علماء کے علوم و صحائف کے خزائن ہیں، صناعوں کی ایجاد ہیں۔ وطن پرستوں کے مواعظ ہیں۔ قومی پیشواؤں اور ملکی داعیوں کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں کی داستانیں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا اگر اپنی عظمت کے اصلی دن کو یاد رکھنا چاہتی ہے تو ان میں سے کسے یاد رکھے؟ ان میں سے کون ہے جس نے دنیا کو سب سے بڑی چیز دی ہے تاکہ وہ بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کی یاد کو پیار کرے۔

## اولوالعزم شہنشاہ

آؤ، ہم سب سے پہلے بڑے بڑے اولوالعزم شہنشاہوں کو دیکھیں جنہوں نے دنیا کے بڑے بڑے رقبوں کو نوکِ شمشیر پر رکھ لیا اور ایسے عجیب و غریب ایوانوں اور محلوں میں بسے، جن کی دیواریں اور چھتیں چاندی، سونے اور لعل و جواہر سے بنائی گئی تھیں۔ انہوں نے بُہت زیادہ مال و متاع جمع کیا، ان کے پاس لوہے کے بہت سے آلات خونریزی تھے اور ان کی اطاعت و غلامی میں انسانوں کا سب سے بڑا گلہ تھا۔ پس ان کی پیدائش کے واقعہ کو بھی سب سے زیادہ عظیم الشان اور ناقابل فراموش ہونا چاہیے۔ لیکن اگر دنیا ان کی

پیدائش کو یادرکھے تو بتلاؤ دنیا کے لیے انہوں نے کیا کیا؟ ان کی فتوحات بہت وسیع تھیں اور ان کی وہ دولت جو انہوں نے زمین کی بستیوں کو اجاڑ کر لوٹی تھی، بڑے بڑے وسیع رقبوں کے اندر آتی تھی، لیکن دنیا کو اس سے کیا ملا کہ دنیا کی گردن ان کی یاد کے آگے: اگر وہ بہت بڑے فاتح تھے، تو اس کو یُوں کہو کہ انہوں نے سب سے زیادہ زمین کو ویران کیا، سب سے زیادہ اس کی آبادیوں کو اجاڑا، سب سے زیادہ خُون کی ندیاں بہائیں اور سب سے زیادہ خدا کے بندوں کے گلے میں اپنی غلامی کی لعنت کا طوق ڈالا۔ پھر کیا دنیا اپنی ویرانیوں ، قتل وغارت، نہب وسلب اور اپنی غلامی کی لعنت کے ناپاک دنوں کو یادرکھے؟ جن کی ابلیسیت نے یہ لعنت پھیلائی تھی، ان کی پیدائش کی نحوست پر خوشیاں منائے؟

## سکندر اور دُوسرے فاتح

سکندر دنیائے قدیم کا سب سے بڑا فاتح تھا، جس نے پُوری دنیا سے اپنے تخت کی پُوجا کرانی چاہی، لیکن دنیا اگر اس کی پیدائش کو یادرکھے تو یہ دن کن واقعات کی یاد ہو گا؟ یہ دنیا کی ویرانیوں، ہلاکتوں اور غلامی کی لعنتوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہو گا، جو اسے ہاتھ آئے گا۔ دنیا میں جس قدر بادشاہ پیدا ہُوئے، اگر تم ان کی زندگی کے تمام کارناموں کا حاصل معلوم کرنا چاہو، تو اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ وُہ جتنے بڑے بادشاہ تھے، اتنے ہی زیادہ انسانوں کو غلام بنانے والے تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی فطری قوتوں کے لیے پتھر تھے، اتنے ہی زیادہ ان کی قدرتی حرکت و نشو کے لیے زنجیر تھے اور اتنے ہی زیادہ خدا کی عطا کردہ جبلت صالحہ اور انسان کے نوعی شرف واحترام کے لیے انکے اندر بربادیوں اور ہلاکتوں کی نحوست تھی، پس جن کا وجود خود دنیا کے لیے ایک زخم تھا، وہ ان کی یاد میں اپنی گم شدہ شفا کیونکر پاسکتی ہے؟

## حکماء وفلاسفہ

حکماء کی حکمت، فلاسفر کا فلسفہ، صناعوں کی ایجادیں، بلاشبہ تاریخ عالم کے اہم مقامات ہیں، لیکن اگر وہ اپنی یاد کے آگے دنیا کو جھکانا چاہتے ہیں، تو انہیں بتلانا چاہیئے کہ انہوں نے اپنی حکمت سرائیوں اور عجیب عجیب ایجادوں سے دنیا کے اصلی دکھ اور زمین کی حقیقی مصیبت کے لیے کیا کیا؟ آسمان کی فضا میں ان گنت ستاروں کی قطاریں پھیلی ہُوئی ہیں۔ بلاشبہ وُہ شخص بہت بڑا غور کرنے والا دماغ اور بڑی ہی کاوش کرنے والی نظر رکھتا تھا، جس نے ہمیں سب سے پہلے بتلایا کہ یہ بڑے بڑے ستارے ہیں، ان میں ثوابت ہیں اور ان کی حرکتوں کے معین اوقات و ایام ہیں، لیکن دنیا جب ستاروں کی یہ بہت بڑی سچائی نہیں جانتی تھی، تو اس وقت بھی بیمار تھی اور یہ معلوم کرکے بھی بیمار ہی رہی۔ اس کا اصلی دکھ یہ نہ تھا کہ انسان آسمان کے متعلق

تھوڑا جانتا ہے، بلکہ ہمیشہ سے وہ اس ایک ہی مرض میں گرفتار رہی ہے کہ انسان خود اپنی نسبت، اپنی فطرت صالحہ کی نسبت، اپنی راہ سعادت کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتا۔

## صنعت گر

اس صناع کو اگر تم بڑا سمجھتے ہو، جس نے انسان کے لیے فن تعمیر ایجاد کیا تا کہ وہ پائدار مکانوں اور خوبصورت چھتوں کے نیچے بیٹھے، تو تمھیں بتلانا چاہیے کہ کیا انسان درختوں کے نیچے بیٹھ کر نیک اور سچا انسان نہ تھا اور بڑے بڑے محلوں کے اندر بس کر اس نے اپنی گم شدہ حقیقت پالی؟ دنیا کا اصلی مرض انسانیت حقیقی کی گم شدگی ہے۔ سعادت انسانی اور امن ارضی ہی وہ نعمت ہے جس کی ڈھونڈ میں ابتدا سے کائنات کا ذرہ ذرہ تہ وبالا ہو رہا ہے۔ پھر بتلاؤ کہ اگر یہ بڑے بڑے صناع اور موجد ہی انسانیت کی سب سے بڑی بڑائی رکھتے ہیں، تو ان کی ایجادوں نے انسان کو کس قدر امن دیا؟ کس قدر سلامتی بخشی؟ کہاں تک صراط سعادت پر چلایا؟ طلسم حیات انسانی کا کون سا راز افشاء کیا؟ خدا اور بندوں کے رشتوں کو کہاں تک جوڑا؟ پھر اگر وہ یہ نہ کر سکے تو دنیا ان کی ایجادات کو اپنے خزانے میں رکھ سکتی ہے، لیکن ان کی یاد میں اس کے لیے کوئی خوشی نہیں ہو سکتی کیونکہ انہوں نے اس کے اصلی دکھ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔

## دور حاضر

اچھا، دنیائے قدیم کے ذخیرے میں جو کچھ ہے، اسے چھوڑ دو، کلدان و بابل اور یونان و اسکندریہ کے کھنڈر اور مسمار شدہ آثار کے اندر اگر دنیا کے لیے کچھ نہ تھا، تو بہت ممکن ہے کہ آج لندن اور برلن و پیرس کی عجیب و غریب آبادیوں اور عقل و فہم کو مبہوت کر دینے والے تمدن کے اندر دُنیا کو وہ چیز مل جائے، جس کے لیے وہ ابتدائے خلق سے حیران و سرگشتہ رہی ہے۔

موجودہ تمدن یورپ کی ابتدا جن بڑے بڑے دعووں سے ہوتی ہے، ضرور ہے کہ وُہ سب کے سب اس وقت تمہارے سامنے ہوں، کیونکہ ہماری موجودہ صحبت ان کے اعادے کی متحمل نہیں۔ ہم کو بتلایا گیا تھا کہ موجودہ تمدن کو دنیا کے قدیم تمدنوں سے کوئی مشابہت نہیں۔ ان کی مختلف شاخوں میں باہم ربط و علاقہ نہ تھا۔ ان کی بنیادیں صحت و حقیقت پر نہ تھیں، وہ انسانی علم و عمل کی تمام شاخوں کو بیک وقت مکمل نہ کر سکی تھی، انہوں نے معلومات و اعمال میں کوئی صحیح نظم و ترتیب پیدا نہیں کی اور انہیں اپنے تمدن کی اشاعت اور پھیلاؤ کے وہ ذرائع حاصل نہ تھے جن کے ذریعہ ہم نے کرۂ ارضی کو علم و تمدن کا ایک گھر بنا دیا ہے۔ پس گزشتہ تمدنوں کی ناکامی سے موجودہ تمدن کی ناکامی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور اسی

طرح کے دعوے تھے جن سے موجودہ تمدن کی فضا بھر گئی تھی اور جن کے ذریعے سے اعلان کیا جاتا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت موجودہ تمدن کی ہے، حالانکہ سب سے بڑا صرف خدا ہے:

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾ (فرقان: ۲۱)

"بلاشبہ انہوں نے یہ کہہ کر اپنے اندر بڑا گھمنڈ پیدا کیا اور بڑی سخت درجے کی سرکشی کی۔"

## اپنے ہاتھوں گھر برباد کرنے والے

سو اب تم دیکھو کہ دنیا اپنے اعتراف کا سر جھکانے کے لیے جب تمدن کے اس سب سے بڑے مغرور بت کی طرف جاتی ہے، تو اسے کیا جواب ملتا ہے۔

آج تمدن کے ابلیسانہ گھمنڈ کا ملعون بُت چُور چُور کر دیا گیا ہے، خدا کا وہ زبردست اور بے پناہ ہاتھ جو قوم ثمود و عاد اور بڑی بڑی آبادیوں اور بڑے بڑے خیموں والوں کو سزا دے چکا تھا، اپنے جلال اور ہولناکی کی آتیشوں کی چمک دکھلا رہا ہے۔ تم یورپ کی موجودہ جنگ [1] اور متمدن اقوام کے باہمی قتل و خونریزی پر چارپایوں کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح نظر ڈالو اور دیکھو کہ یہ کیا ہے جو تمہارے سامنے ہو رہا ہے؟ یہ تمدن اور وحشت کی پکار نہیں، یہ علم اور جہل کی ٹکر نہیں یہ تمدن ہے جو تمدن سے ٹکرا رہا ہے، یہ علم ہے جو علم کو ذبح کر رہا ہے۔ یہ صناعت ہے جو صناعت کو پیس رہی ہے۔ یہ ایجاد کا مغرور شیطان ہے، جو ایجاد ہی کے شیطان لعین کو ڈس رہا ہے اور اس طرح تمدن کا گھمنڈ ہی ہے جو تمدن کے گھمنڈ کو ریزہ ریزہ اور پاش پاش کر رہا ہے۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ "اپنے گھروں کو وہ اپنے ہاتھوں ہی سے اجاڑ رہے ہیں۔"

پس اگر مسکین دنیا ان انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے جو تمدن کے بادشاہ تھے، علم کے فرمانبردار تھے اور ایجاد صناعت کے دیوتا تھے، تو تم اس کا ہاتھ پکڑو اور اسے آج یورپ کے ان میدانوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دو جہاں تمدن و علم کا تخت عظمت و جلال آگ اور لہو کی بدلیوں اور دُھوئیں اور زہریلی گیسوں کی مسموم فضا کے اندر بچھایا گیا ہے اور مسمار عمارتوں کے کھنڈروں، سُرخ سرخ خون کی ندیوں اور انسانوں کی تڑپتی ہُوئی لاشوں کے تودوں پر اس کے سنہرے ستون عظمت نصب کیے گئے ہیں۔ پھر اس سے کہو کہ وُہ اپنی احسان مندی اور شکر گزاری کے لیے ان عظیم الشان انسانوں میں سے کسی کی بڑائی کو چھانٹ لے، جو آج

---

[1] یہ مقالہ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۹۱۸) کے دوران میں لکھا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹-۱۹۴۵) نے اس کے مطالب کی مزید تصدیق کر دی۔ عاد و ثمود، فرعون اور ہزاروں دوسرے سرکش مختلف طریقوں سے فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ یورپ پر موت و ہلاکت کی جو ہولناک آفتیں عالمی جنگوں کی شکل میں مسلط ہوئیں' وہ بھی تو بہ ہر حال ویسے ہی عذاب تھے جو سابقہ قوموں پر مختلف اوقات و ادوار میں نازل ہو چکے تھے۔ کیا اہل یورپ نے اپنے ہاتھوں اپنے گھر برباد نہ کیے؟ ہٹلر، سٹالین، چرچل، دوسرے لوگ ایک دوسرے کو کاملاً مٹا دینے کے لیے ہر ممکن جدوجہد نہ کرتے رہے؟

گیہوں اور جَو کے لیے روتے ہیں کیونکہ ہوا میں اڑنے کے آلات اور پانی کو مفرد اجزا میں بدل لینے کا علم ان کے کچھ کام نہ آیا۔

## کس کی یاد منائیں؟

وہ ان میں سے کس کو اپنی پرستش اور یاد کے لیے چُنے گی؟ کیا وہ اس سب سے بڑے فلسفی کو یاد کرے گی، جو چودھویں صدی عیسوی میں آیا اور اس نے تجربے کی راہ کھولی، جس راہ نے انسانوں کو ہلاکت اور خونریزی کے سب سے زیادہ رُوح پاش آلات تک پہنچا دیا؟ وہ کیمسٹری کے اس دیوتا کو یاد کرے گی جس پر موجودہ تمدن کو سب سے زیادہ ناز ہے اور جس نے ایسی زہریلی گیسیں، ایسے مہلک بم اور شیل اور ایسے بے پناہ مرکبات بنا دیے جن کے آگے انسانی جماعتیں بالکل بے بس ہو جاتی ہیں اور منٹوں کے اندر بڑی بڑی آبادیاں موت کی لعنت سے بھر جاتی ہیں؟ اچھا، بھاپ کی طاقت کے مُوجد کو بلاؤ، اس کی بڑائی کیسی عجیب تھی جس نے بھاپ کی غیر معلوم طاقت کو انسان کے تابع کر دیا؟ لیکن آہ! وہ اس دنیا کے لیے کیا کرے جو موت کی نہیں، بلکہ زندگی کی بھُوکی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ بھاپ کے شیطان ہی کے اندر وہ سب سے بڑی بے پناہ خباثت ہے، جس نے آج جنگ کے میدانوں میں مختلف بھیسوں اور مختلف صورتوں کے اندر موت کی سب سے بڑی پھنکار ماردی ہے اور تمام انسانی علم ودانائی اس کے بچاؤ کے لیے بیکار ہے!

پھر کیا دنیا تمدن و علم کے ان مغرور بانیوں کی پیدائش پر خوشیاں منائے جنہوں نے اس کی موت اور ہلاکت کے لیے تو سب کچھ کیا، پر اس کے امن وسلامتی اور سعادت وطمانیت کے لیے کچھ نہ کر سکے؟ ان کے پاس انسان کے اڑنے، سمندروں کے اندر جانے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموج اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا سفیر بنانے اور خود بخود بجنے والے باجوں اور بڑے تیزی سے چلنے والی سواریوں کے لیے تو بڑا ذخیرہ ہے۔ لیکن انسان کو نیک اور راست باز بنانے، خدا کی عدالت و صداقت سے زمین کو معمور کرنے، امن اور راحت کی بادشاہت کے قائم کر دینے، ظلم و فساد کے بیج سے زمین کو صاف کرنے، طاقت اور حکم کے جبر سے ضعف اور ناتوانی کو بچانے اور انسانوں کو درندوں اور سانپوں کی طرح نہیں، بلکہ انسانوں کی طرح بسا دینے کے لیے کُچھ بھی نہیں۔

## قرآن حکیم کا درس حکمت

تم نے یورپ کے تمدن کی، کتوں کی طرح لوٹ کر اور بھیڑوں کی طرح چل کر ہمیشہ پرستش کی ہے اور مذہب کی تعلیمات کی ہنسی اڑائی ہے کہ وہ "آخرت آخرت" کہتا ہے، مگر یورپ کی طرح دنیا کے لیئے

کچھ نہیں بتلاتا لیکن شاید تم آج قرآن کی اس آیت کو سمجھ سکو۔ جس کے متعلق حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اس کی تلاوت آخری زمانے کے فتنہ سے بچائے گی:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ (کہف:۱۰۳۔۱۰۵)

"تم کو بتلاؤں کہ سب سے زیادہ ناکام و نامراد گھرانے والے کون ہیں؟ وہ جن کی تمام قوت سعی صرف دنیا کی زندگی سنوارنے ہی میں کھوئی گئی اور جہل حقیقت نے ان میں یہ گھمنڈ پیدا کر دیا کہ بہت سی خوبیوں کا کام کر رہے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے پروردگار کی آیتوں اور اس کے حضور حاضر ہونے سے انکار کیا۔ پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور قیامت کے دن انہیں کوئی وزن نصیب نہ ہو گا۔"

دوسری جگہ ارباب کفر کے اعمال یہ بتلائے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ (روم:۷)

"صرف دنیا کی زندگی کا ایک ظاہری پہلو انہوں نے جان لیا ہے اور وہ آخرت کے علاقوں سے بالکل غافل ہو گئے۔"

آخرت سے مقصود یہ نہیں کہ دنیا اور دنیا کے اعمال ترک کر دیے جائیں، بلکہ اس کی عملی تفسیر یورپ کی موجودہ زندگی کو سمجھو، جس نے اپنے تئیں صرف دنیا ہی کے لیے وقف کر دیا اور اس کے گھمنڈ میں وُہ اللہ اور اس کے رشتے کے لیے کوئی وقت اور فکر نہ نکال سکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے وہ چیز تو حاصل کر لی، جس کا نام تمدّن رکھا گیا ہے، لیکن وُہ شے حاصل نہ کر سکی جو انسان کے لیے امن حقیقی کی راہ اور اسلام و سعادت فکری کی صراط مستقیم ہے۔

## خدا کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم

تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ان انسانوں کا حال ہے، جن کی بڑائیاں صرف جسم و مادہ تک محدود تھیں لیکن اگر دنیا کے لیے ان کی پیدائش کی یاد میں کوئی تسکین اور راحت نہیں تو وہ ان تمام صفوں سے باہر آ جائے گی اور دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے دامن میں پناہ لے گی۔ وہ بانیان مذہب کی عظمتوں کا نظارہ کرے گی۔ وہ خدا کے رسولوں اور اس کے پاک پیاموں کے پیامبروں کو ڈھونڈے گی۔

ہاں، اگر دنیا ایسا کرے تو یہ فی الحقیقت اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو گا، اس کے دائمی درد اور بے قراریوں کے لیے سکھ اور راحت کی ایک حیات بخش کروٹ ہو گی اور وہ بلاشبہ منزل مقصود کو پالے گی۔ قرآن حکیم نے بھی اس کے دکھ کا یہی علاج بتایا ہے اور جب کہ وہ بادشاہوں، قومی پیشواؤں، کاہنوں اور

علم و مذہب کے جھوٹے مدعیوں کے دامنِ غرور میں لپٹی ہوئی تھی تو اسے وصیت کی کہ وہ سچائی کے رسولوں اور خدا کے داعیوں کی راہ اختیار کرے اور انہی کی زندگی کو اپنا نصب العین بنائے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (سورۃ فاتحہ)

"خدایا تو ہمیں صراط مستقیم پر چلا، وہ صراط مستقیم جو تیرے نبیوں، صدیقوں، شہیدوں، صالح بندوں کی راہ ہے۔"

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں بھی آکر وہ کون سی زندگی ہے، جس کے اعمال دعوت کے اندر دنیا کو پیامِ امن و سعادت مل سکتا ہے؟

دنیا میں آج جو بڑے بڑے مذاہب موجود ہیں، وہ علم الاقوام کی تقسیم کے مطابق دو قسموں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک سیما طیقی (سامی) سلسلہ ہے، جس کے ماتحت یہودی اور مسیحی قومیں اب تک دنیا میں باقی ہیں۔ دوسرا آرین سلسلہ ہے جس سے گوتم بدھ اور ہندوستان کے تمام داعیان مذاہب وابستہ ہیں۔

## حضرت موسیٰ علیہ السلام

پھر دنیا کے لیے اگر سب سے بڑا رسول یہودی مذہب کی تاریخ میں ہے، تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور ان کی پیدائش کو سب سے بڑا واقعہ قرار دے گی، لیکن اگر اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے یہ سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعمال حیات مقدس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مصر کی ایک جابر و ظالم گورنمنٹ کے پنجہ استبداد سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور اسے غلامی کی ناپاکی سے نکال کر جو انسانیت کے لیے سب سے بڑی ناپاکی ہے، حکومت اور امن و عزت کی طہارت تک پہنچادیا۔

بلاشبہ انھوں نے اپنی قوم یعنی بنی اسرائیل کی نسل کے لیے بڑا ہی مقدس جہاد کیا اور یہ ان کا یادگار عالم اسوۂ حسنہ ہے، جس کی دنیا کو تقدیس کرنی چاہیے، لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے تمام دنیا کے لیے کیا کیا؟ دنیا صرف بنی اسرائیل ہی کا نام نہیں۔ [1] غیر الٰہی عبودیت کی زنجیریں صرف بنی اسرائیل ہی کے پاؤں میں نہیں تھیں، بلکہ کرۂ ارضی کی تمام آبادی کے پاؤں اس کے بوجھ سے زخمی تھے، پس دنیا کے لیے وہی تلوار محبوب ہو سکتی ہے جو صرف فرعون کی ڈالی ہوئی زنجیریں ہی نہ کاٹے، بلکہ دنیا کے تمام فرعونوں کے تخت اُلٹ دے۔

---

[1] دراصل ان کی رسالت کا دائرہ کار ہی ان کی قوم تھی نہ کہ بین الاقوامیت۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلائی، مگر پوری دنیا غلامی سے نکلنے کی آرزو مند ہے۔

## حضرت عیسیٰ علیہ السلام

دُوسرا سب سے بڑا اسرائیلی مذہب مسیحی تحریک کا ہے لیکن مسیحی دعوت کی تعلیم ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ مسیحیت سے منسوب قومیں جو کچھ کہیں گی ہم اسے حضرت مسیح علیہ السلام کے نام سے قبول نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا کہ میں صرف تورات کو قائم کرنے آیا ہوں، خود کوئی نئی دعوت نہیں لایا (متی ۱۷:۵) انہوں نے تصریح کی میرا مشن صرف بنی اسرائیل کی اصلاح تک محدود ہے۔ نیز انھوں نے غیر قوموں میں منادی کرنے سے روکا۔ [1] اور ہمیشہ اپنے کاموں اور اپنی وصیتوں میں اپنی تعلیم کو اسرائیل کے گھرانے تک ہی محدود رکھا۔ پس دراصل انھوں نے جو کچھ بھی خدمت کرنی چاہی وہ محض بنی اسرائیل نامی ایک مسخ شدہ قوم کی تھی، تمام دنیا کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

پھر ان کا ظہور اس وقت ہوا جب روم کی ظالمانہ حکومت نے شام کے مقدس مرغزاروں کو روند ڈالا تھا اور بت پرست قوموں کی جابر و مستبد گورنمنٹیں دنیا کے بڑے حصے کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھیں، لیکن انھوں نے نہ تو اس ظلم و طغیان کے متعلق کچھ کہا اور نہ اس سے کچھ تعرض کیا۔

## مسیحی قومیں اور تعلیم مسیح علیہ السلام

پہلی صدی مسیحی کے بعد جس قدر مسیحی قومیں دنیا میں آباد ہُوئیں، ان کو حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم و دعوت سے کچھ تعلق نہ تھا اور وہ سرتاسر یونان کے ایک تعلیم یافتہ یہودی پولس کے مذہب کی پیرو تھیں۔ پولس نے تمام حواریان مسیح علیہ السلام کے مذہب کے خلاف غیر اسرائیلی انسانوں کو بپتسما دینا شروع کیا اور اس طرح روم اور یونان کے مختلف جزیروں اور دیہاتوں میں ایک نیا گروہ پیدا کر لیا پس اگر دنیا حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف جھکنا چاہے گی، تو دنیا کو ان کے کارنامۂ حیات کے لیے بمشکل ایک چوتھائی صدی ہاتھ آئے گی، جس کے اندر ان کے تربیت یافتہ حواریوں کے اعمال نظر آسکتے ہیں اور یہ چند سال فضائل و محاسن اخلاق کا کیسا ہی عمدہ نمونہ پیش کریں، لیکن ان میں دنیا کے لیے کوئی پیغام نجات نہیں۔

پھر اس سے بھی قطع نظر کرو، نتائج کی بحث بعد کو آتی ہے۔ سب سے پہلے دعوت، اعلان، ادعاء اور نفس تعلیم کا سوال ہے۔ دنیا حضرت مسیح علیہ السلام کی یاد پر کیونکر قناعت کرے، جب کہ خود انھوں نے دنیا

---

[1] غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور نہ سامریوں کے کسی شہر میں داخل ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی ۱۰:۶)

کے لیے کچھ نہ کیا، بلکہ ہمیشہ اسے ٹھکرایا، مردود کہا اور اس کے ساتھیوں کو، اس کے دوستوں کو اور اس سے رشتہ رکھنے والوں کو خدا کی بادشاہت کی مہربانی سے محروم بتلایا، حتیٰ کہ ایک آخری فتویٰ دے دیا" تم خدا اور دنیا، دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے (متی ۶:۲۵) اونٹ کا سُوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو"۔ (متی ۱۹:۲۴)

اس سے در گزر کرو اور اس کی بہتر سے بہتر توجیہ جو کر سکتے ہو کر لو اور نیز پولس کی دعوت ہی کو حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت تسلیم کر لو اور ان تمام قوموں کو جنہوں نے مسیح علیہ السلام کے نام پر بپتسمے کا پانی اپنے اوپر چھڑکا، مسیحی دعوت کا پھل مان لو، لیکن پھر بھی مسیحی تحریک کی پوری تاریخ کا کیا حال ہے؟

## مسیحیت کی حکمرانی

جب تک مسیحیت دنیا پر حکمران رہی، جس وقت تک مسیحی مذہب کا دینی تسلط انسانوں سے اطاعت کراتا رہا اور جب تک کہ مسیحی رہنماؤں کی غلامی سے دنیا نے انحراف نہ کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک اس کا وجود دنیا کے لیے، دنیا کے علم و تمدن کے لیے، آبادی و عمرانی کے لیے، اخلاق و پاکیزگی کے لیے اور ان سب سے بڑھ کر یہ ایک انسان کی فطری حریت اور شرف انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت رہا، جس نے جلایا، ویران کیا، مسمار کیا، قتل کیا، جیل خانے بھرے، زبانوں پر مہریں لگائیں، انسانی دماغوں کو معطل کیا، لیکن انسان اور انسانیت کی راستی و ترقی کے لیے چند لمحوں کا بھی ایک دور پیدا نہ کیا۔[1] مشہور مورخ گیزو، سیدیو، لامارے اور ڈریپر اس بارے میں ہمارے لیے بہترین راوی ہیں۔

لیکن جس وقت سے کہ مسیحیت کی قوت نے شکست کھائی تمدن کا غیر دینی دور شروع ہوا۔ مذہبی جماعتوں اور مذہبی خلافت (یورپ) کے حلقہ غلامی سے یورپ آزاد ہو گیا اس وقت سے یورپ کے موجودہ تمدن کی بنیاد پڑی اور مسیحی قوموں نے ترقی شروع کی۔ اگر تم کہتے ہو کہ دنیا کے لیے سب سے بڑی عظمت مسیحی مذہب کے بانی میں تھی، تو خود اس کے بانی ہی نے ہمیں معیار حق و باطل بھی بتلا دیا ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" (مرقس ۱۹۔۱۶) پس دنیا اگر مسیحی مذہب کی پیدائش کے اندر اپنی خوشی کو ڈھونڈے تو اس کو انسان کے امن و سلامتی اور فطرت کی آزادی و سعادت کی جگہ قتل و غارت اور ہلاکت و

---

[1] یورپ اور امریکہ مسیحیت کے بہت بڑے مراکز ہیں، کیا ان کی سر گزشت استعمار خواہ اس کی شکل کوئی ہو، ابتدا سے آج تک عالم انسانیت کے لیے خصوصاً کمزور قوموں، ملکوں اور ملتوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت نہیں بنی رہی؟ اور آج بھی ہر مصیبت کا سر چشمہ یہی استعمار نہیں جس کی وجہ سے امن عالم معرض خطرے میں ہے؟ پہلے جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) استعمار پرستوں کی ذاتی اغراض کے باعث برباد ہوئی آج انجمن اقوام متحدہ ویسی ہی حالت سے دوچار ہے۔

غلامی کی یادگار کا جشن منانا پڑے گا کیونکہ "مسیحیت" کے درخت کا تو یہی پھل ہمارے سامنے ہے، پھر کیا دنیا اس کے لیے تیار رہے؟

یہ جو کچھ تھا، مسیحی اقوام کی تاریخ قدیم کی بنا پر تھا لیکن اگر اس پر گزشتہ دو صدیوں کے واقعات و نتائج کا بھی اضافہ کر دیا جائے جو اقوام یورپ کے اعمال تمدن سے وابستہ ہیں تو دنیا کی مایوسی اور زیادہ درد انگیز ہو جائے۔

## آریائی نسل کی دعوتیں

اس کے بعد مذاہب عالم میں آرین نسلوں کی دعوتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، لیکن افسوس کہ دنیا کے لیے ان کے پاس بھی کوئی پیام سعادت نہیں۔ عظیم الشان گوتم بدھ کی تعلیم ووصایا کا ماحصل یہ بتلایا جاتا ہے کہ "نجات دنیا کے ساتھ رہ کر حاصل نہیں ہو سکتی"۔ پس دنیا کو جن لوگوں نے ٹھکرا دیا، دنیا ان کے پاس جا کر کیا سکھ حاصل کرے گی؟ پھر اس نے جو کچھ بھی بتلایا اور سکھلایا ہو، لیکن قوموں اور ملکوں کے دائرہ ہی میں اس کی دعوت محدود رہی۔ ہندوستان میں اسے شکست ملی تو جاپان اور چین میں جا کر محدود ہو گئی۔ پس زمین اپنی اس مصیبت کے لیے جو رقبوں اور ملکوں میں محدود نہیں، عظیم الشان بدھ سے کیا حاصل کر سکتی ہے؟

ہندوستان کے مذہبی ذخیرہ تعلیمات اور ان کی پُر اثر قدامت کی وقعت سے ہم انکار نہیں کر سکتے، تاہم دنیا کے لیے ان کے بانیوں کی عظمت کے اندر کیا خوشی ہو سکتی ہے جب کہ کوہ ہمالیہ کی دیواروں اور بحیرہ عرب کی موجوں سے باہر بھی دنیا ہے، مگر ہندوستان کے مذہبی داعیوں نے صرف ہندوستان کے اندر بسنے والوں ہی کو اپنی ہدایتیں سُپرد کیں۔

## نجات و تسکین کا واحد پیام

پس دنیا اگر اپنی نجات کے لیے بے چین ہے تو اس کے لیے راحت اور تسکین کا پیام صرف ایک ہی ہے اور صرف ایک ہی کی زندگی میں ہے۔ اس کا دکھ ایک ہی ہے اس لیے اس کی شفا کے نسخے بھی ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اس کا پروردگار ایک ہے جو اپنے ایک ہی آفتاب کو اس کے خشک و تر پر چمکاتا اور ایک ہی طرح کی بدلیوں سے اس کے آباد و ویرانے کو شاداب کرتا ہے۔ اس کی ہدایت و رحمت کا آفتاب بھی ایک ہی ہے اور بہت سے ستارے اس کی روشنی سے اکتساب نور حاصل کرتے ہوں مگر ان سب کا مرکز و منبد نورانیت ایک ہی ہے۔

قرآن حکیم نے آفتاب کو "سراج" کہا:

وَّ جَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾ (نباء:۱۳)

"اور ہم نے آسمان میں سورج کے چراغ کو بڑا ہی روشن بنایا۔"

اور اسی طرح اس کے ظہور کو بھی "سراج" کہا، جس کی ہدایت و رحمت کی روشنی کرۂ ارضی کی ظلمتوں کے لیے پیام صبح تھی:

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيۡرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيۡرًا ﴿۴۶﴾

(احزاب:۴۵-۴۶)

"اے پیغمبر اسلام ! ہم نے تم کو دنیا کے آگے حق کی گواہی دینے والا، سعادت انسانیت کی خوشخبری پھیلانے والا، اللہ کی طرف اس کے بندوں کو بلانے والا اور دنیا کی تاریکیوں کے لیے ایک چراغ نورانی بنا کر بھیجا۔"

## کرۂ ارض کے لیے آفتاب ہدایت

پس تمام کرہ ارض کی روشنی کے لیے یہی ایک آفتاب ہدایت ہے، جس کی عالم تسخیر کرنوں کے اندر دنیا اپنی تمام تاریکیوں کے لیے نور بشارت پا سکتی ہے اور اس لیے صرف وہی ایک ہے جس کے طلوع کے پہلے دن کو دنیا کبھی نہیں بھلا سکتی اور اگر اس نے بھلا دیا ہے تو وہ وقت دُور نہیں جب اسے کامل عشق و شیفتگی کے ساتھ صرف اسی کے آگے جھکنا پڑے گا اور اسی کو اپنا کعبہ امید بنانا پڑے گا۔

اس مقدس پیدائش نے دنیا میں ظاہر ہو کر یہ نہیں کہا کہ میں صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے آیا ہوں، بلکہ اس نے کہا کہ تمام عالم انسانیت کو غیر الٰہی قوموں سے نجات دلانا میرا مقصد ظہور ہے۔ اس نے صرف اسرائیل کے گھرانے کی گم شدہ رونق ہی سے عشق نہیں کیا، بلکہ تمام عالم کی اجڑی ہوئی بستی پر غمگینی کی اور ان کی دوبارہ رونق و آبادی کا اعلان کیا۔ اس نے اس خدا کی محبتوں کی طرف دعوت نہیں دی جو صرف سینا کی چوٹیوں یا ہمالیہ کی گھاٹیوں میں بستا ہے، بلکہ اس رب العٰلمین کی طرف بلایا جو پورے نظام ہستی کا پروردگار ہے اور اس لیے تمام کائنات عالم کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ ہم کو دنیا میں سکندر ملتا ہے جس نے تمام عالم کو فتح کرنا چاہا تھا لیکن ہم دنیا کی پوری تاریخ میں خدا کے کسی رسول کو نہیں پاتے جس نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا ہو۔

## جہانوں کے لیے رحمت

اس کا صرف ایک ہی اعلان ہے جو آغاز خلقت سے اب تک کیا گیا ہے اور اس لیے اگر دنیا نسلوں، قوموں اور رقبوں کا نام نہیں بلکہ مخلوقات الٰہی کی اس پوری نسل کا نام ہے جو کرۂ ارض کی پیٹھ پر بستی ہے تو وہ مجبور ہے کہ ہر طرف سے مایوسی کی نظریں ہٹا کر صرف اس ایک ہی اعلان عام کے آگے جھک جائے اور صرف اسی کی پیدایش کے دن کو اپنی عمر کا سب سے بڑا دن یقین کرے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۙ﴿۱﴾ (فرقان:۱)

"کیا ہی پاک اور برکتوں کا سرچشمہ ہے ذات اس کی جس نے اپنے برگزیدہ بندے پر الفرقان نازل کیا تاکہ وہ قوموں اور ملکوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالموں کی ضلالت کے لیے ڈرانے والا ہو۔"

دنیا میں جس قدر داعیان حق و صداقت کے اعلانات موجود ہیں۔ اگر دنیا ان کو بھلا دے گی تو یہ صرف قوموں اور ملکوں کی سعادت کی فراموشی ہو گی کیونکہ اس سے زیادہ انہوں نے کچھ نہ کہا لیکن اگر ربیع الاول کو اس نے بھلا دیا تو یہ تمام کرہ ارض کی نجات کو بھلا دینا ہو گا کیونکہ ربیع الاول کی رحمت کسی ایک سرزمین کے لیے نہیں بلکہ تمام عالمین کے لیے تھی (یہاں تک جو کچھ حوالہ قلم ہوا، یہ محض ایک تمہید تھی اور اسلام کی رحمت عامہ کا ایک سرسری مطالعہ، لیکن اس کے بعد اصل سوال ہمارے سامنے آتا ہے یعنی اس پیدایش نے دنیا کی حقیقی اور عالمگیر مصیبت کے لئے کیا کیا؟ اور انسانیت کی سعادت وارتقاے فطری کی کیونکر تکمیل کی؟ اس مبحث عظیم کا احاطہ و استقصاء تو ممکن نہیں لیکن چند سرسری اشارات آنے والی مجلس میں ملیں گے)۔

# ربّ العٰلمین اور رحمۃً للعٰلمین

## آفتاب توحید وہدایت

قرآن حکیم نے توحید الٰہی کے داعی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم کو "سراج منیر" سے ملقب کیا اور ان کے خصائص کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

(احزاب: ۴۵،۴۶)

"اے پیغمبر! بے شک ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت پہنچانے والا، ضلالت وخبائث سے خوف دلانے والا۔ راہ الٰہی کی طرف داعی اور ایک نورانی مشعل بنا کر بھیجا ہے۔"

لیکن ایک دوسرے موقع پر آفتاب کو بھی "سراج" کے لقب سے یاد کیا ہے:

وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ (نوح: ۱۶)

"اور آسمان میں خدا نے چاند کو بھی بنایا، جو ایک نور ہے اور سورج کو بھی بنایا کہ وہ ایک روشن مشعل ہے۔"

اس مماثلت اور اشتراک تشبیہ سے مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتاب مادی کی طرح ایک آفتاب روحانی ہے۔ آفتاب جب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور، اعلیٰ وادنیٰ، سیاہ و سفید، باغ و دشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلا تمیز مکان و مقام ہر شے پر چمکتی اور ہر حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہ یہی حال اس آفتاب دعوت الٰہی اور نیر درخشان سمائے رسالت کے عموم فیضان بخشی کا تھا، جو گو سعیر سے چلا، مگر فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا جس کی کرنوں میں داہنی جانب شریعت الٰہی کی "نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ" (مائدہ-۱۵) تھی مگر بائیں جانب قیام عدل و میزان کی شمشیر آبدار چمک رہی تھی جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروز مندی تھا کیونکہ آسمان ہدایت پر شریعت الٰہی کے گو سینکڑوں ستارے نمودار ہوئے تھے لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع کا انتظار ہوتا ہے:

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی ۙ﴿۳﴾ (واللیل۔۱۔۳)

"رات کی قسم، جبکہ اس کی تاریکی کائنات کی تمام اشیاء کو چھپا دیتی ہے اور روز روشن کی قسم، جبکہ آفتاب کی تجلی تمام کائنات کو روشن کر دیتی ہے اور دراصل اس خالق کی قسم، جس نے تخلیق عالم کے لیے نر اور مادہ کا وسیلہ پیدا کیا۔"

## عالمگیر اخوت واتحاد

اس آفتاب توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق وانشقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹا دیا۔ اس کی روشنی کی فیضان بخشی میں اسود وابیض اور عرب وعجم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ خدا کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ "رب العلمین" تھا، پس ضرور تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے والا بھی "رحمۃ للعلمین" ہو:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (الانبیاء۔۱۰۷)

"اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا، مگر تمام عالموں کے لیے رحمت قرار دے کر۔"

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی، کہ اس نے رشتہ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی، قوموں کے باہمی اختلافات ونزاعات کا گھر بنا دیا تھا، لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے، جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں، بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت واتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰی وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰىكُمۡ ؕ (حجرات:۱۳)

"اے لوگو ہم دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ، ورنہ دراصل یہ تفریق وانشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز وشرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔"

## صرف ایک رشتہ

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن ومقام اور رنگ وزبان کی تفریق کوئی چیز نہیں رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے "وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ" (الروم۔۲۲) لیکن اس کو وہ کسی انسانی تفریق وتقسیم کی حد نہیں قرار

دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں، اصلی رشتہ صرف ایک ہے وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دُور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ (مومنون: ۵۲)

"بیشک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں۔ پس (انکار و بد عملی کے نتائج سے) ڈرو"

## مقام محمود

آیت ۷۹ (بنی اسرائیل[1]) میں مقام محمود سے مراد ایسا درجہ ہے جس کی عام طور پر ستایش کی جائے فرمایا: کچھ بعید نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچا دے جو عالمگیر اور دائمی ستایش کا مقام ہو۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب پیغمبر اسلام کی مکی زندگی کے آخری سال گزر رہے تھے۔ مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی، حتیٰ کہ مخالفین قتل کی تدبیروں میں سرگرم تھے۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ ابھی مظلومیتوں سے فتح و کامرانی پیدا ہو سکتی ہے؟ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی، کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہ تھی بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسانی کے لیے عظمت وار تفاع کی سب سے آخری بلندی ہے۔ یعنی عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ حسن و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیت حاصل ہو جائے گی۔ کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستایش ہو گی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہو گی۔ محمود یعنی سرتاسر ممدوح ہستی ہو جائے گی۔ (بنی اسرائیل۔ ۷۹)

ماشئت قل فیه، فانت مصدّق
فالحب یقضی والمحاسن تشهد!

## انسانی عظمت کی انتہا

---

[1] وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾۔ (بنی اسرائیل: ۷۹)
"(اے پیغمبر) رات کا کچھ حصہ یعنی پچھلا پہر شب بیداری میں بسر کر، یہ تیرے لیے ایک مزید عمل ہے قریب ہے، اللہ تجھے ایسے مقام میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو۔"

یہ مقام، انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی سعی وہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ جاسکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پاسکتی کہ روحوں کی ستایش دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ سکندر کی ساری فتوحات خود اس کے عہد وملک کی ستائش اسے نہ دلا سکیں اور نپولین کی ساری جہاں ستانیاں اتنا بھی نہ کر سکیں کہ کورسیکا کے چند غدار باشندوں ہی میں اسے محمود وممدوح بناتیں، جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ محمودیت اسی کو حاصل ہوسکتی ہے جس میں حسن وکمال ہو، کیونکہ رُوحیں حسن ہی سے عشق کرسکتی ہیں اور زبانیں کمال ہی کی ستایش میں کھل سکتی ہیں، لیکن حسن وکمال کی مملکت، وہ مملکت نہیں جسے شہنشاہوں اور فاتحوں کی تلواریں مسخر کرسکیں۔

## زبانوں کی ستائش اور روحوں کا احترام

غور کرو، جس وقت سے نوع انسانی کی تاریخ معلوم ہے، نوع انسانی کے دلوں کا احترام اور زبانوں کی ستایش کن انسانوں کے حصے میں آئی ہیں؟ شہنشاہوں اور فاتحوں کے حصے میں یا خدا کے ان رسولوں کے حصے میں جنھوں نے جسم وملک کو نہیں روح ودل کو فتح کیا تھا؟

یہی مقام محمود ہے جس کی خبر ہمیں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے اور خبر کے ساتھ امر بھی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ [1]

(احزاب:۵)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا ایک مشہور وہ معاملہ ہوگا، جو قیامت کے دن پیش آئے گا، جبکہ اللہ کی حمد وثناء کا علم آپ بلند کریں گے اور بلاشبہ محمودیت کا مقام دنیا وآخرت دونوں کے لیے ہے۔ جو ہستی یہاں محمود خلائق ہے، وہاں بھی محمود وممدوح ہوگی۔

## جامعیت افضلیت رسول اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ان آیات کریمہ [2] سے فضیلت وسیادت حضرت ختم المرسلین کا یوں اثبات ہوا کہ امت مسلمہ کو

---

[1] اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر (علیہ السلام) پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے تم بھی اس پر صلوٰۃ بھیجو اور سلام، اچھا سلام۔

[2] كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ الخ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۔

ساری امتوں سے بہتر فرمایا اور شریعت محمدیہ کو تکمیل ادیان اور اتمام نعمت قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مستلزم افضلیت مطاع اور نعمت کا اتمام نعم سابقہ سے اعلیٰ و دائم ہونا، حامل و مبلغ نعمت کے اعلیٰ و افضل ہونے پر دلیل ہے۔ اگر آخری شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ہے، اگر آخری امت ساری پچھلی امتوں کے برکات و نعم سے مالامال اور اس لیے ان سب سے امثل و اصلح ہے اور اگر اس طرح شریعت آخری کے ظہور و زمان و مکان و قوام و اعمال کی ساری باتیں پچھلی امتوں کی ان ساری باتوں پر فوقیت و فضیلت رکھتی ہیں تو یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ امت آخری کا رسول و مقوم بھی سارے پچھلے رسولوں کے مراتب و مقامات کا جامع اور اس لیے ان سب سے افضل و مافوق اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہو۔ کتاب و سنت کے نصوص و تصریحات اس بارے میں بے شمار ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ (البقرہ۔ ۲۵۳) کی تفسیر میں اس مطلب کو کمال شرح وبسط اور شاید ایک طرز تازہ واستدلال جدید کے ساتھ لکھا جاچکا ہے اور حقیقت جامعیت رسالت محمدی و جامعیت شریعت اسلامیہ و جامعیت امت مسلمہ اور جامعیت جمیع مایتعلق بہا پر ایک خاص اسلوب نظر سے بحث کی گئی ہے [1] باقی رہا "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" (البقرہ۔ ۲۸۵) تو وہ معاملہ دوسرا ہے "تفریق بین الرسل" کو مسئلہ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح "لا تفضل علی یونس بن متی وغیر ذٰلك" تو اس نہی کا مورد و محل بھی دوسرا ہے اور منہی عنہ معاملہ تفضیل میں وہ تکلم یار ائے ہے۔ منجربہ تفریق بین الرسل جس نے تمام امم سابقہ کو گمراہ کیا، نہ کہ نفس تفضیل۔ کیونکہ "انا سید ولد آدم ولا فخر" اور "آدم ما دون تحت لوائی" کے بعد اور کیا باقی رہ گیا؟ پھر قطع نظر قرآن حکیم کے، خود نصوص سنت اس بارے میں بے شمار و معلوم ہیں۔

## رب زدنی علما

آیت ۱۱۴ [2] (طٰہٰ) میں فرمایا: جب تک سلسلہ وحی پورا نہ ہو جائے، اس بارے میں جلدی نہ کر اور منتظر رہ کہ فیضان غیب کی بخششیں کہاں تک مالامال کرتی ہیں۔ تیری زبانِ حال کی صدا تو یہ ہونی چاہیے کہ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا! یعنی میری تشنگی کی سیرابی کے لیے علم کے یہ سارے دریا اور عرفان حقیقت کی یہ ساری بارشیں بھی کافی نہیں۔ اے علم کی لا انتہائی اور حقیقت کی ناپید کناری! اپنی بخششیں اور زیادہ کر۔

---

[1] مطلب ہے تفسیر "البیان" میں۔

[2] فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَقُّ ۚ وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰۤى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ ۖ وَقُلۡ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾
"پس ہر طرح کی بلندی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی جہاندار حقیقی ہے اور جب تک قرآن کی وحی تجھ پر پوری نہ ہو جائے تو اس میں جلدی نہ کر۔ تیری پکار یہی ہو کہ پروردگار! میرا علم اور زیادہ کر۔"

اس آیت نے واضح کر دیا کہ پیغمبر اسلام کے مقام علم و عرفان کی وسعت و عظمت کا کیا حال تھا؟ وہ کسی حد پر بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے کوئی زیادتی بھی زیادتی نہ تھی۔ اس کے لیے ہر اضافہ نئے استفاضہ کا اشارہ تھا۔ اس کے لیے ہر عطیہ نئے عطیہ کا تقاضا تھا۔ وہ یکسر طلب تھی۔ پیہم رب زدنی کا سوال تھی۔ یہ معلوم ہے کہ یہاں مطلوب کی وسعت کے لیے کوئی انتہا نہیں ہو سکتی، لیکن یہ کیونکر معلوم کیا جائے کہ طالب کی طلب کہاں جا کر منتہی ہوئی تھی۔

## کائنات انسانیت پر احسان عظیم

حضرت رحمۃ للعٰلمین ﷺ نے کائنات انسانیت پر جو لا تعد و لا تحصٰی احسان کیے، ان کا استقصاء کون کر سکتا ہے۔ ان میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ ہر قسم کے تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر کی زنجیریں کاٹ ڈالیں اور سب کے لیے استقلال و حریت ذات و رائے، شرف و احترام نفس اور مساوات صحیح کی بنیادیں استوار کر دیں۔

دنیا استبداد و استعباد کے عذاب الیم میں مبتلا تھی۔ غلامی کی زنجیروں نے اس کا بند بند جکڑ رکھا تھا۔ فرمانروایانِ ملک، امرائے شہر، روسائے قبائل اپنے اپنے حلقہ فرمانروائی میں "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (آل عمران: ٦٤) تھے اور ان کے اطاعت گزار اور پیروان کے ہاتھ بالکل مثل معدوم الارادہ آلات عمل کے تھے، جن کی زندگی کا موضوع واحد صرف اپنے قادر قابض کی تکمیل ہوا سے نفس و اتباع مرضات کیا؟

مسیح علیہ السلام سے سترہ سو برس پہلے ذات شاہی ہر تقدیس سے متصف، ہر احترام فوق العادہ سے مقدس اور ہر نقص و عیب سے مبرا تھی۔ خدا کا سایا کم از کم مرتبہ انسانیت سے ایک بالاتر شے ضرور تھی۔

فراعنہ مصر دیوتا تھے۔ اسی لیے مصر کے فرعون نے مسیح علیہ السلام سے سترہ سو برس پہلے اپنے درباریوں سے کہا تھا "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" (النازعات۔٢٤) یعنی موسٰی کا خدا کون ہے؟ تمہارا بڑا خدا تو میں ہوں۔ کلدانیوں کے ملک میں نمرود بابل کی پرستش کے لیے ہیکل بنتے تھے۔ ہندوستان کے راجا دیوتاؤں کے اوتار بن کر زمین پر اترتے تھے۔ ردمہ کا پوپ "خدا کے فرزند" کا جانشین اور اس کا آستانہ مقدس سجدہ گاہ ملوک و سلاطین تھا۔

روم کے قیصر اور فارس کے کسری گو دیوتا نہ تھے لیکن فطرت بشریت سے منزہ اور مرتبہ انسانیت سے بالاتر تھے، جن کے سامنے بیٹھنا ممنوع، جن کے نام لینا سوءِ ادب، جن کے سامنے ابتدائے کلام گناہ اور جن کے سامنے ادنیٰ سا اعتراض بھی موجب قتل تھا۔

دنیا اسی تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر میں اسیر تھی کہ بحر احمر کے سواحل پر ریگستانی سرزمین میں ایک "عربی بادشاہ" کا ظہور ہوا، جس نے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیے۔ بابائے رومۃ

الکبریٰ کے ایوان مقدس کی بنیادیں ہلادیں۔ تعبد و غلامی کی زنجیریں اس کی شمشیر غیر آہنی کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں ۔ استقلال ذات و فکر، حریت خیال ورائے، شرف واحترام نفس، مساوات حقوق، ابطال شہنشاہی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ شاہان عالم مرتبہ قدوسیت و معصومیت سے گر کر عام سطح انسانی پر آ گئے اور عام انسان سطح غلامی و حیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم وایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے۔

## دینِ رحمت

اسلام دین رحمت ہے۔ اس دین کی کوئی بھی مشق ایسی نہیں، جو عالم انسانیت کے لیے بلالحاظ نسل و خون، بلا امتیاز رنگ و نسب اور بلا قید مقام و محل یکساں پیامِ رحمت نہ ہو۔ سب سے پہلے اصولی اعتبار سے غور کیجیے۔ دنیا میں ہر نیک و بد کے لیے مہلت حیات اور فیضان معیشت کا انتظام موجود ہے، البتہ اس نظام سے استفادہ ہر فرد کی ہمت، صلاحیت اور جدوجہد پر موقوف ہے۔ کیونکہ:

زندگی جہد است واستحقاق نیست

قدرت نے گوناگوں نعمتوں کے لامتناہی خزانے جابجا مہیا کر رکھے ہیں۔ اچھے بُرے تمام انسان ان سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں۔ جزائے اعمال آخرت پر اٹھار کھی گئی ہے۔ یہ اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں رحمت کی کارفرمائی ہے:

رحمت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہو اور مہلت حیات پوری طرح سب کو ملے۔ اس نے انسانوں کی انفرادی زندگی کے دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ دینوی زندگی کا ہے اور سراسر مہلت ہے۔ دوسرا حصہ مرنے کے بعد کا ہے اور جزا کا معاملہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْيُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾ (کہف:۵۸)

"تیرا پروردگار بڑا بخشایش گر اور رحمت والا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو ان کے عمل کی کمائی پر پکڑتا تو فوراً عذاب نازل کر دیتا۔ لیکن ان کے لیے ایک میعاد ٹھہرادی گئی ہے۔ جب وہ نمودار ہو گی تو اس سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ انہیں نہ مل سکے گی۔"

مہلت بجائے خود رحمت ہی کی دستاویز ہے تاکہ نیک زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائیں اور برائیوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو اعمال بد سے توبہ کی مہلت حاصل رہے۔ عمل بد کا ارتکاب ہوتے ہی عذاب نازل ہو جاتا تو مہلت کہاں رہتی؟ یادرکھیے کہ اصلاح و درستی کا طریقہ یہی ہے اور اصل نصب العین اصلاح و درستی

ہی ہے نہ کہ عذاب۔ عذاب تو ان کے لیے ہو سکتا ہے جو سمجھانے بجھانے، آگاہ کرنے اور مہلت دینے کے باوجود فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے غلط مسلک پر قایم واستوار رہیں۔

جرموں اور گناہوں کی نوعیت یا کمیت و کیفیت کیسی ہی ہو، جب توبہ و انابت کے احساس میں جنبش نمودار ہوتی ہے اور غفلت و بے حسی کا خواب سنگیں ٹوٹتا ہے تو رحمت قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور توبہ کرنے والے کے نامہ اعمال کی سیاہی اس طرح ڈھل جاتی ہے۔ گویا اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا تھا یہ بھی سراسر رحمت ہی کی کارفرمائی کا ثبوت ہے۔

قرآن مجید ہر بندے کو رحمت کی بشارت پہنچا رہا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی برے اور مکروہ کیوں نہ ہوں:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ (زمر: ۵۳)

"اے میرے بندو! (جنھوں نے برائیوں کے ارتکاب سے) اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا۔"

## اسلام کے ضوابط

اسلامی ضوابط کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ہر قسم کے اختلال سے محفوظ رہے اور معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا نہ ہونے پائے، جو اجتماعی زندگی کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتا ہے۔
ویسے ہر مجموعہ وضوابط کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے دو باتیں بطور خاص پیش نظر رہنی چاہیئے:

۱۔ آیا اجتماعی زندگی کے لیے قوانین بنانے کے سلسلے میں جائز انفرادی انسانی حقوق کا پورا لحاظ رکھا گیا؟ ایسا نہ ہو تو جائز انفرادی حقوق اور اجتماعی قوانین میں تصادم کی نوبت آتی رہے گی اور ان حالات میں کوئی معاشرہ اختلافات سے، زیادہ عرصے تک محفوظ نہ رہ سکے گا۔

۲۔ اجتماعی قوانین کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ افراد کے درمیان باہم محبت، رحمت اور رافت کو فروغ حاصل ہو؟ جس سے اجتماعی زندگی کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جائیں گی۔ افراد اجتماعی نظام کے عقیل، فہیم، عاقبت اندیش اور حق شناس کارکن بنے رہیں گے، ان میں ایک دوسرے کے حقوق کی حدوں کا اندازہ کر لینے کی تمیز زیادہ قوی ہوتی جائے گی اور ایک دوسرے کا زیادہ سے زیادہ لحاظ ان کی فطرت ثانیہ بن جائے گا۔

اسلام ایسے ہی معاشرے پیدا کر دینا چاہتا تھا، اس کے مجموعہ ضوابط (جن میں اخلاقی تلقینات بھی شامل ہیں) کا اصل مقصد یہی تھا کہ انسانوں میں ذمّہ داری کے احساس کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے،

جس کے بعد کسی احتسابی نظام کی ضرورت بھی محض برائے نام رہ جائے۔ ابتدائی دور کی مربیانہ سیاست میں اس مقصد کی تکمیل یقیناً بہت قریب نظر آنے لگی تھی۔ لیکن حالات نے یکا یک پلٹا کھایا اور مربیانہ سیاست کی جگہ ملوکی نظام نے لے لی۔ پھر جو صورت حال پیش آئی اس کا مرقع صدیوں سے ہر حساس فرد کے لیے دل کا ناسور ہے۔ سب سے بڑھ کر اندوہ و قلق کی بات یہ ہے کہ بیشتر نعرے اسلام کے لگائے جاتے ہیں اور پیش نظر وہی پیمانے ہوتے ہیں، جو دورِ ملوکیت میں فروغ پذیر ہوئے۔

## باہم سلوک کی مثالیں

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ترى المومنين تراحمهم وتوادّهم و تعاطفهم كمثل الجسد اذا اشتكى عضوتداعى له سائرجسده بالسَّهَرِ والحُمّٰى [1]

"تو مومنوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کے اعضا کی طرح دیکھے گا۔ جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے پورا جسم بے خوابی اور بخار کی دعوت بن جاتا ہے۔"

آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آیا آپس میں اس رحم، اس محبت اور اس مہربانی کی عملی مثالیں آپ کو کسی طرف نظر آتی ہیں؟ الاّ ماشاء اللہ، یا ہمارے گرد و پیش ایسا کوئی نظارہ روح و قلب کے لیے سرور شادمانی کی بشارت بن سکتا ہے؟

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والله لايومن والله لايومن والله لايومن قيل و من يا رسول الله۔ قال الذى لايامن جارهٗ بوائقهٗ [2]

"اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، اللہ کی قسم وہ ایمان نہیں لاتا، کسی نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون؟ فرمایا جس کا ہمسایہ اس کی بدیوں سے امن میں نہ ہو۔"

غور کریں کہ اگر ہر ہمسایہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل پیرا ہو جائے۔ ہر لحظہ خیال رکھے کہ اس کی کسی حرکت سے ہمسایے کو تکلیف نہ پہنچے تو پوری آبادیاں نہ محض ہر قسم کے شر سے پاک ہو جائیں بلکہ تمام باشندوں میں ایک دوسرے کے متعلق انتہائی محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو جائیں حالانکہ یہ بظاہر ایک جزوی ارشاد ہے تاہم اس کی عملی صورت پر غور کریں تو اس کی وسعت اور اثر خیر کا اندازہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

یہ اسلام تھا جو دنیا کے لیے رحمت و رافت اور برکات و سعادت کی بشارت لے کر آیا تھا۔ کیا اس سے

---

1. صحیح بخاری، کتاب الادب باب رحمة الناس والبهایم۔
2. صحیح بخاری، کتاب الادب باب اثم من لا یامن جاره۔

کسی کے لیے داعی اسلام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ''رحمۃ اللعٰلمین'' کا اندازہ کرلینا مشکل ہے؟

## اشرف المخلوق کے واجبات

انسان کو اشرف المخلوق قرار دیا جاتا ہے۔ کیا اس لیے کہ اس پر فخر و مباہات کی سرشاری میں واجبات کو نظر انداز کردیا جائے؟ انسان نیک و بد کی تمیز سے بہرہ مند ہے۔ آگ اور پانی میں فرق کرسکتا ہے۔ پھر کیا اس سے کوئی ایسی حرکت یا کوئی ایسا عمل سرزد ہونا چاہیے، جو انسانیت کے حسن اور شرف کے منافی ہو اور جو اسے ''اسفل سافلین'' میں پہنچادے؟ یعنی جس سے ہم جنسوں کے طبعی و فطری حقوق پر زد پڑے، خواہ ان کا تعلق ہم جنسوں کی جانوں سے ہو یا اموال سے یا آبرؤوں سے؟ ایسا ہر فعل لازماً اجتماعی امن و راحت کے نظام میں کم یا زیادہ اختلال کا باعث ہوگا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے اختلال انگیز افعال و حرکات سے احتراز حقیقتہً ہر فرد کے لیے ضروری ہے کیونکہ اگر زید کی کوئی حرکت کسی وقت بکر اور اس کے ساتھیوں کو نقصان پہنچائے گی تو دوسرے موقع پر بکر یا اس کے ساتھیوں کی ایسی ہی حرکت خود زید یا اس کے ساتھیوں کے لیے موجب آزار ہوگی۔

اسلام کی برتری یہ ہے کہ اس کے تمام اوامر و نواہی کی بنیاد و اساس معاشرے میں رحمت و محبت جاری و ساری رکھنے کے لیے ہے۔ وہ چاہتا ہے رحمت و محبت کے فروغ و عمومیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ تمام افراد معاشرہ کے درمیان اخوت، خلوص، ہمدردی اور یکجہتی کے روابط زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوں، یہ سب رحمت ہی کی کار فرمائی کے عوامل ہیں۔

## محبوب معبود

غرض اسلام نے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قایم کیا ہے، اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت اور محبت ہی پر رکھی ہے، قرآن مجید کی مختلف تصریحات کے مطابق خدا اور بندوں کے درمیان بھی رشتہ محبت ہی کا ہے۔

سچی عبودیت ہے اسی کی عبودیت جس کے لیے معبود صرف معبود ہی نہ ہو، بلکہ محبوب بھی ہو۔ اسی لیے فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرۃ۔۱۶۵)

''اور جو لوگ ایمان والے ہیں، ان کے دلوں میں تو سب سے بڑھ کر چاہت اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔''

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾

(آل عمران:۳۱)

"(اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے واقعی محبت رکھتے ہو تو چاہیے کہ میری پیروی کرو۔ (کیونکہ میں تمہیں اللہ سے محبت کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔"

## حبّ رسول ﷺ

خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکت سے محبت بھی اسی لیے دنیا بھر کے انسانوں پر فایق و برتر ہو گئی کہ ان کے ذریعے سے ہمیں خدا کا راستہ ملا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ و الناس اجمعین۔ [1]

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کے نزدیک باپ، بیٹے اور پورے عالم انسانیت سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔"

رسول اللہ ﷺ جو نور ہدایت لے کر آئے، اس کے سوا ہدایت کا کوئی وجود نہیں اور انسان کے لیے سب سے پہلی چیز ہدایت حق ہے، اس کے بعد تمام رشتے آتے ہیں اور خود رشتوں کے واجبات نیز ان کی تکمیل و سرانجام کے طریقے ہمیں اسی نور ہدایت سے ملے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے ہماری زندگی میں مشعل راہ بنا۔

## خدا سے محبت کی عملی راہ

یہ بھی بتا دیا کہ خدائے بزرگ و برتر سے محبت کی عملی راہ خدا کے بندوں کی محبت سے ہو کر گزری ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے، اسے چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور حضور ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

قرآن مجید اور احادیث میں خدا کے بندوں سے پیار کے لیے جو کچھ موجود ہے اس کا خاصا بڑا حصہ جا بجا پیش کیا جا چکا ہے اور اعادہ غیر ضروری ہے۔ اس دنیا میں نگرانی اور دیکھ بھال کے محتاجوں کی کوئی صنف ایسی نہیں، جس کے لیے مختلف صورتوں میں انفاق کے احکام موجود نہ ہوں۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کی اعانت، بیواؤں، مسکینوں اور اسیروں کی امداد، غلاموں کو غلامی سے چھڑانا، مسافروں کی خبر گیری، قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے سہارا دینا غرض کون سی ضرورت ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا؟ واضح رہے کہ اسیروں سے مراد وہ لوگ نہیں جو جرموں کے ارتکاب

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حب الرسول ﷺ۔

کے بعد جیل خانوں میں چلے جاتے ہیں، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں پکڑے جائیں یا زمانہ ماضی کی طرح اب کوئی ظالم شخص کسی کو گرفتار کر کے اپنا کام لینے لگے۔

جہاں صحیح اسلامی معاشرہ موجود ہو اس کے تمام افراد اپنے واجبات کتاب وسنت کے مطابق پُورے کریں، وہاں کوئی ایسا محتاج نظر ہی نہیں آسکتا، جسے کسی کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھنے یا ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہو۔ ارباب استطاعت کا اسلامی جذبہ خیر نیز محتاج کی اسلامی خودداری اور عزت نفس، دونوں اپنی جگہ کار فرما ہوں گے۔ پہلے گروہ کے نزدیک انفاق اسی طرح واجب ہے، جس طرح خود اس گروہ کے لیے ذاتی ضروریات پُورا کرنا واجب ہے۔ محتاج کسی سے نہیں لیتا کہ اس کا ممنون ہو، اللہ نے اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور وہ اپنا حصہ لیتا ہے۔ یہ اسلام تھا جو رسول اللہ ﷺ دنیا بھر کے انسانوں کے لیے لائے تھے۔

## حضور ﷺ کے چند ارشادات

حضور ﷺ کے بعض ارشادات بھی ملاحظہ کر لیجیے، فرمایا:

۱۔ خدا کی رحمت انہی بندوں کے لیے ہے جو خدا کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں۔

۲۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

۳۔ جو شخص رحم کرے گا، اگرچہ ایک چڑیا ہی کے لیے کیوں نہ ہو، خدا اس پر رحم کرے گا۔

۴۔ "مَنْ لَّا یَرحَمَ لَا یُرحَمَ۔" یعنی جو شخص رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"

۵۔ ایک اعرابی نے نماز پڑھتے ہُوئے دعا کی کہ اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم کر اور ہمارے ساتھ اور کسی پر رحم نہ کر، جب وہ نماز ادا کر چکا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تو نے بہت وسعت والے کا دروازہ تنگ کر دیا۔

اعرابی نے یہ دُعا بُری نیت سے نہیں کی تھی، اس کے تصورات ہی اس قسم کے تھے، حضور ﷺ نے سمجھا دیا کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ تمام انسانوں کے لیے بھلائی مانگنے سے بھی اس کی رحمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

## صفات الٰہی کا پر تو

انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تشبہ پیدا کیا جائے یعنی اتنا تشبہ جتنا انسان کے بس میں ہو۔ ان صفات کا عکس انسان کے آئینۂ فکر و عمل میں ٹھیک ٹھیک اتارنے کے لیے کوئی وقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید ہم میں خدا کی رحمت کا تصور پیدا کرنا چاہتا ہے تو صرف اس لیے کہ

ہم بھی سراپا رحمت بن جائیں۔ اسی طرح قرآن خدا کی ربوبیت، رافت، شفقت اور احسان، نیز دوسری صفات کا نقشہ کھینچتا ہے تاکہ ہم میں بھی بقدر ہمت واستطاعت انہی صفات کا جلوہ نمودار ہو۔

قرآن ہمیں بار بار سناتا ہے کہ خدا کی بخشش و درگزر کی کوئی انتہا نہیں اور اس طرح ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے لیے بخشش و درگزر کا غیر محدود جوش پیدا ہو جانا چاہیے! اگر ہم اس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لیے اس کی بخشایشوں کا انتظار کریں؟۔

یہ آخری فقرہ اس حدیث پر مبنی ہے کہ مَنْ لَّا یَرحَمَ لَا یُرحَمَ۔

## احکام و شرائع اور تلقینات

جس حد تک احکام و شرائع کا تعلق ہے، جَزَٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُھَا (شوریٰ۔ ۴۰) (برائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی) اپنی جگہ قائم ہے کیونکہ تمام انسان حوصلے اور ہمت میں یکساں نہیں ہوتے اور نہ ہر جرم ایسا ہوتا ہے کہ بخشا جائے تو مرتکب پر یا معاشرے کے حالات پر بہ ہر حال اچھا اثر پڑے گا۔
تاہم کتاب الٰہی کی تلقینات ہر لحظہ پیش نظر رہنی چاہییں، جو عزیمت کی متقاضی ہیں مثلاً:

۱۔ پھر جس نے درگزر کیا اور معاملے کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔(شوریٰ:۴۰)
۲۔ اور جو کوئی برائی پر صبر کرے اور بخش دے تو یقیناً یہ اولوالعزمی کی بات ہے۔(شوریٰ:۴۳)
۳۔ خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں اللہ کے لیے خرچ کرنے والے، غصے کو پی جانے والے، ہم جنسوں کے قصور بخش دینے والے اللہ کی محبت انہی محسنین کے لیے ہے۔ (آل عمران:۱۳۴)
۴۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی رضا و خوشنودی کے لیے (تلخی و ناخوشگواری) صابرانہ برداشت کرلی، نماز قائم رکھی، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے پوشیدہ اور علانیہ (ہمارے بندوں کے لیے) خرچ کرتے رہے اور برائی کا جواب برائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیا تو یقین کرو کہ یہی لوگ ہیں، جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔(رعد:۲۲)
۵۔ اور اگر تمہیں بدلا چاہیے کہ جتنی اور جیسی برائی تمہارے ساتھ کی گئی، ٹھیک اسی کے مطابق بدلا لو اور اگر تم برداشت کر جاؤ تو صابروں کے لیے برداشت کرلینا ہی بہتر ہے۔(نحل:۱۲۶)

## اللہ کی بے پایاں رحمت

رسول اللہ ﷺ ہی کی ذات گرامی ہے جس کے ذریعے سے خدائے قدوس کی بے پایاں اور لا

متناہی رحمت کی بشارت بندگانِ خدا کو ملی۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ۔ (اعراف: ۱۵۶)

"میری رحمت کا یہ حال ہے کہ ہر شے پر چھائی ہُوئی ہے۔"

صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر کچھ قیدی آئے۔ ان میں سے ایک عورت کو بچہ مل گیا، جو اس کا تھا۔ دیکھتے ہی ماتا کی خاص تڑپ کے ساتھ اس سینے سے لگا کر دُودھ پلانے لگی۔ بچہ مل جانے کی خوشی اور دُودھ پلانے کی پُر سرور تسکین سے وہ بظاہر اس درجہ سرشار ہو گئی کہ گردوپیش اور ماحول کا بھی کچھ خیال نہ رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیفیت دیکھ کر فرمایا۔

اترون ھٰذہ طارحۃٌ ولدھا فی النار قلنا: لا وھی تقدر ان لا تطرحہ۔ فقال: اللہ رَاحِمٌ بعبادہ من ھٰذہ بولدھا۔

"تمہارا کیا خیال کہ آیا یہ عورت اپنا بچہ آگ میں ڈال دینے کے لیے تیار ہو جائے گی؟ ہم نے عرض کیا کہ جب تک اس کی طاقت و قدرت میں ہے کبھی نہ ڈالے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ رحیم ہے جتنی یہ عورت اپنے بچے کے لیے ہے۔"

انسانوں، حیوانوں، پرندوں، چرندوں، درندوں وغیرہ میں سے کسی گروہ کو لے لیجیے، بچے کے لیے ماں کی ماتا سے بڑھ کر پُرخلوص محبت کا نظارہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماتا کا نظارہ دیکھ کر بندوں کے لیے اللہ کی رحمت کا ذکر فرما دیا اور اس محبت کا نقش لوگوں کے قلوب و ارواح پر جما دینے کی صورت اس کے سوا کیا تھی کہ دنیا کی بہترین محبت سے بہ طور مثال کام لیا جائے۔ حقیقۃً بندوں سے اللہ کی محبت کا صحیح اندازہ پیش کرنے کی دل نشین تر صورت کون سی ہے؟

## جزئیات مسائل

اگر آپ بعض امور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی جزئیات سامنے رکھ لیں تو یقین ہے کہ سراپا حیرت زدہ رہ جائیں گے کیونکہ آج تک کائنات انسانیت کا کوئی بڑے سے بڑا عالم، فلسفی یا کوئی اور شخص ایسا استقصا نہیں کر سکا۔ تاہم وہ بیان کر دی جائیں تو آپ کے قلب و رُوح سے بے اختیار صدا بلند ہو گی، بلاشبہ ان میں سے ہر جزئیہ حق ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ پڑوسیوں کے حقوق کی نشاندہی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

۱۔ اگر پڑوسی بیمار ہو تو اس کی عیادت اور خبر گیری کی جائے۔

۲۔ اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کا ساتھ دو یعنی تدفین میں ہاتھ بٹاؤ۔

۳۔ اگر وہ ضرورت مند ہو اور تم میں استطاعت ہو تو اسے قرض دو۔

۴۔ اگر وہ کوئی برا کام کر بیٹھے تو اس کی پردہ پوشی کرو۔
۵۔ اگر اسے کوئی نعمت یا مال ملے تو مبارک باد دو (جس سے دلی مسرت کا اظہار مقصود ہوتا ہے)۔
۶۔ اگر اس پر کوئی مصیبت آپڑے تو اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرو۔
۷۔ اپنے گھر کی عمارت اس طرح بلند نہ کرو کہ پڑوسی کے گھر کی ہوا رک جائے۔
۸۔ جب تمہارے گھر میں کوئی اچھا کھانا پکے تو کوشش کرو کہ تمہاری ہنڈیا کی مہک پڑوسی (اور اس کے بال بچوں تک) نہ پہنچے۔ یہ ان کے لیے باعث ایذا ہو گی یا اپنے اوپر لازم کر لو کہ اس کھانے کا کچھ حصہ پڑوسی کے گھر بھی بھیجو گے۔

پھر پڑوسیوں کی قسمیں بتائیں یعنی:

۱۔ غیر مسلم جس کے ساتھ رشتہ داری بھی نہیں نچلے درجے کا پڑوسی ہے یعنی اس کے بھی حقوق ہیں، مگر دوسروں سے کم۔
۲۔ مسلم پڑوسی جس کے ساتھ رشتہ داری نہ ہو، اس کا درجہ پہلے کے مقابلے میں بلند تر ہے۔
۳۔ رشتہ دار مسلم پڑوسی یعنی پڑوسی بھی، مسلم بھی اور رشتہ دار بھی، یہ سب سے اونچے درجے پر فائز ہے۔ آپ کو ان جزئیات کی کوئی مثال کسی دوسری جگہ مل سکے تو مہربانی فرما کر پیش کر دیجیے۔ اور یہ صرف ایک مسئلے کے متعلق ہے۔ ہر مسئلے میں آپکو ایسی ہی جزئیات ملیں گی جو سامنے آجائیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی واقعی جزئیات ہیں، ورنہ کسی کی نظر ان گہرائیوں پر جا ہی نہیں سکتی۔

## بنیادی امر

یہ پاک دین تھا، جس کی دعوت کے لیے رسول اکرم ﷺ مبعوث ہُوئے۔ اسلام کا خدا رؤف و رحیم، اسلام کا رسول ﷺ رؤف و رحیم، اسلام کے پیرووں کو زیادہ سے زیادہ رحمت و محبت، شفقت اور عفوو درگزر کی تعلیم دی گئی تھی۔ عالم انسانیت کی اصلاح و درستی کا کار اہم اسی طرح بوجہ احسن پُورا ہو سکتا تھا۔ بلاشبہ بدلے کی گنجائش رکھی گئی۔ کیونکہ تمام انسان عزم الامور کی ترازو میں پُورے نہیں اُتر سکتے، لیکن ترجیح عزم الامور ہی کو حاصل ہے اور مقاصد اصلاح و درستی کو جلد سے جلد پایہ تکمیل پر پہنچانا بھی عزم الامور ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اصلاح کے سلسلے میں بنیادی امر یہ ہے کہ جن کی اصلاح مقصود ہو، انھیں سب سے پہلے یہ یقین ہو جائے کہ ان کے ساتھ داعی اصلاح کو دلی ہمدردی ہے۔ یہ یقین داعی کے بلند طرز عمل ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے دائرہ اصلاح پھیلتا جائے گا فتنہ و فساد کا ازالہ ہوتا جائے گا۔ نئے نئے داعی بروئے کار آئیں گے۔ اس طرح رحمت خداوندی سے کیا بعید ہے کہ کروڑوں انسان تھوڑے ہی عرصے میں راہ حق پر لگ جائیں۔ "يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" (النصر۔۲) کا ایک منظر وہ تھا

جس نے رسول ﷺ کی ذات بابرکات کے معبوث ہونے کی ضرورت پوری کر دی۔ "یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا" کا آخری منظر ابھی باقی ہے۔ جب شش جہت سے اعتراف رحمۃ للعلمین کی صدائے حق بلند ہو گی اور کائنات انسانیت کے لبوں پر اللّٰھم صل علیٰ سیّدنا و مولانا محمدٍ وّ آلہ وسلم کا ترانہ ہو گا۔

## عظیم ترین محسن انسانیت

آپ نے کبھی سوچا کہ خونی رشتے سے بڑھ کر سچی، پر خلوص اور مستحکم محبت پیدا کرنے کے مؤثر ترین وسائل کیا ہیں؟ حضور ﷺ کے بعض ارشادات پر ایک سرسری نظر ڈال لیجیے آپ کو یقین ہو جائے گا کہ انسانیت پر اس بنیادی اور دوامی احسان کے لیے جو طریقے حضور ﷺ نے اختیار فرمائے۔ ان سے بہتر اور حصول مقصد کے لیے مؤثر ذریعے کوئی نہیں ہو سکتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا:

"بدگمانی سے دور رہو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو، عیب جوئی نہ کرو، باہم بغض نہ رکھو اور بھائی بھائی ہو جاؤ۔ [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

"آپس میں بغض نہ رکھو، باہم حسد نہ کرو، آپس کے تعلقات نہ توڑو اور خدا کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ تین روز سے زیادہ قطع تعلق رکھے"۔ [2]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

"رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، جب تم میں سے کسی کے ہاں سالن پکے تو اسے چاہیے کہ شوربا زیادہ کر لے۔ پھر اس میں سے کچھ پڑوسی کو بھی بھیج دے"۔ [3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا (یعنی میری جماعت میں سے نہیں) جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر مزے سے سو جائے جب اس کے پہلو میں رہنے والا پڑوسی بھوکا ہو اور پیٹ بھر کر سو جانے والے کو علم ہو کہ پڑوسی بھوکا ہے"۔ [1]

---

1. صحیح بخاری، کتاب النکاح باب لایخطب علیٰ خطبۃ اخیہ۔
2. صحیح بخاری، کتاب الادب باب ماینھیٰ عن التماس
3. رواہ الطبرانی الاوسط۔
1. رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

آج رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے کتنے مدعی ہیں جو حقیقی ایمان کی اس میزان میں پورے اتر سکتے ہیں؟ جو لوگ محض اتفاقات کی بنا پر کچھ عرصے کے لیے امر و حکم میں شریک ہو جاتے ہیں، وہ اپنے عالی شان ایوانوں میں اس طرح پیٹ بھر کر سوتے ہیں کہ لاکھوں بھوکوں اور محتاجوں کا احساس تک انھیں نہیں رہتا۔ احساس ہو تو تڑپ کر باہر نہ نکل آئیں؟ احساس ذمہ داری ان کو تھا جو راتوں کو جگہ جگہ خفیہ خفیہ دورے کر کے اندازہ کیا کرتے تھے کہ کوئی ستم زدہ ان کے دائرہ علم سے باہر تو نہیں رہ گیا؟ پھر دیکھیے ارشاد کا مدعا جہاں یہ ہے کہ مختلف انسانی حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں یہ بھی ہے کہ ان میں وہ محبت وہ رحمت اور وہ شفقت بروئے کار آجائے، جو خونی رشتوں میں بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ اگر انسانیت کا کوئی محسن اس عظمت و شان کا ہے تو اس کا نشان بتائیے۔ یہ منصب ازل سے رحمۃ للعلمین ﷺ کے لیے خاص ہو گیا۔

# اُسوۂ محمدی ﷺ

## احتساب

احتساب ایک سنہری زنجیر ہے، جس میں تمدن، اخلاق، مذہب اور معاشرت کی تمام جزئیات جکڑی ہوئی ہیں۔ اگر اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے تو دفعتۃً نظام عالم کی ایک ایک کڑی درہم برہم ہو جائے۔ اسی غرض سے دنیا نے احتساب کو مختلف صورتوں میں قایم رکھا۔ خاندانوں اور کنبوں نے مختلف رسم و رواج اختیار کیے، جن کی خلاف ورزی موجب ملامت، بلکہ بعض اوقات قوی جرم خیال کی جاتی ہے، سلطنتوں نے قوانین بنائے جو انسان کو ایک خاص نظام کے ماتحت ہر قسم کی مادی، اخلاقی اور مذہبی ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ حکماء نے فلسفہ اخلاق ایجاد کیا، جو اخلاقی قوانین کی پیروی پر جمعیتہ بشری کو مجبور کرتا ہے۔

## ہمارا سرمایہ فخر

اگر یورپ کو اپنی تہذیب پر فخر ہے کہ وہ انسان کی ہر فروگزاشت پر سختی کے ساتھ گرفت کرتی ہے۔ اگر رومن لا (رومی قانون) کو اپنے اوپر ناز ہے کہ وہ دنیا کے قوائے متضادہ کو اپنے مرکز سے ہٹنے نہیں دیتا، اگر یونان کو اپنے فلسفہ اخلاق پر گھمنڈ ہے کہ وہ اخلاقی قویٰ کی تربیت کرتا ہے تو ہمیں ان کے بڑے بول سے مرعوب نہیں ہو جانا چاہیئے۔ ہم رسم و رواج کے غلام نہیں کہ یورپ کے قوانین معاشرت پر فریفتہ ہو جائیں۔ ہم قانونی سختیاں برداشت کرنے کے خوگر نہیں کہ اپنے ہاتھ کو ہر ہتھکڑی کے حوالے کردیں۔ قیاسات عقلی ہماری غذائے روحانی نہیں کہ یونانیوں کے طلسم میں پھنس جائیں، بلکہ ہمارے رگ اور پٹھے ایک پاک مذہب کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے گوشت اور خون پر چمڑے کی جگہ مذہب کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ہمارے قلب کو ایک غیر متزلزل مذہبی احساس حرکت دے رہا ہے، پس ہم کو ہر دلفریب رسم و رواج، ہر مرعوب کرنے والے قانون اور ہر متحیر کر دینے والے فلسفے کو چھوڑ کر اپنی باگ صرف اسلام ہی کے ہاتھ میں دینی چاہیے اور اس پر فخر کرنا چاہیے کہ:

رشتہ در گرونم افگندہ دوست

مے برد ہر جاکہ خاطر خواہ اوست

### اسوۂ حسنہ

مذہب کی قوت احتساب ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر آنحضرت ﷺ کا اتباع فرض کر کے ہم کو پوری دنیا کی مادی و اخلاقی غلامی سے آزاد کر دیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب: ۲۱)

"یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی و اتباع کا بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: کہ تم رسول اللہ کی تقلید کرو، کیونکہ ایک کی تقلید کرنے سے دوسرے اشخاص کی تقلید کی نفی نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ فرمایا کہ تمہاری تقلید صرف اسی پاک ذات ﷺ میں محدود ہے کیونکہ تمہیں اعمال صالحہ کا یہ خزانہ دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ اس طرز بیاں سے نہ صرف جناب رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازم کر دیا گیا، بلکہ ساتھ ہی دوسرے تمام بڑے بڑے انسانوں کے اتباع کی نفی بھی کر دی۔ اس لیے کہ صرف ایک ہی آفتاب ہے جس کی روشنی، ظلمت زار دنیا کی ہر اندھیری اور ہر تیرہ و تاریک راہ میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے!

جو غلام آفتا بم ہمہ ز آفتاب گو یم
نہ شبم نہ شب پر ستم کہ حدیث خواب گویم
(مولانا رومؒ)

## آیات و احادیث

اسی آفتاب کی روشنی سے اور سیارے بھی نور حاصل کرتے ہیں، اس لیے ان کا اتباع بھی ہم پر واجب ہو جاتا ہے:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم

"بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد ان لوگوں کا دور جو اس کے بعد آئیں گے، پھر وہ لوگ جو اس کے بعد اسوہ حسنہ کی تقلید کریں گے۔"

اصحابی کالنجوم

"میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں"۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی اس خصوصیت کا بار بار ذکر کیا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ ۡ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهٰىهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ كَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

۔(اعراف:۱۵۷)

”جو رسول اور نبی ﷺ امّی کی پیروی کریں گے، جس کی بعثت توراۃ وانجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انہیں نیکی کے کاموں کا حکم دے گا۔ برائیوں سے روکے گا۔ پاک و مفید چیزوں کو ان پر حلال اور ناپاک و مضر چیزوں کو حرام کرے گا۔“

كُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ

(آل عمران:۱۱۰)

”تم لوگ بہترین امت ہو جسے خدا نے دنیا کی ہدایت ورہنمائی کے لیے نمایاں کیا۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو۔“

لیکن ان آیتوں کی عملی تفسیر ہمیں صرف احادیث کی کتابوں میں ڈھونڈنی چاہیے جن کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مواقع احتساب کے ایک ایک جزیے کا پتا لگ سکتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہدایت وارشاد کے لیے جو آفتاب اور سیارے پیدا کیے تھے، وہ ہمیشہ ضیا گستر رہتے تھے۔

احتساب کی ترتیب اصلاح نفس سے شروع ہو کر بالترتیب محتسب کے قبیلے اور قوم تک منتہی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرض احتساب اسی ترتیب کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔

## اصلاح نفس

آنحضرت ﷺ کی ذات پاک جامع فضائل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے تمام زلاّت کو معاف کر دیا تھا، بایں ہمہ آپ ﷺ اس کثرت سے نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں پھول کر پھٹ جاتے تھے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس ریاضت شاقہ کو دیکھ کر عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! خدا نے تو آپ ﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، پھر آپ ﷺ کیوں اس قدر مصروف عبادت رہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

افلا اکون عبداً شکورا [1]

---

[1] بخاری مطبوعہ بولاق ص: ۹۹ جز: ۸ کتاب التحجد باب قیام النبی ﷺ باللیل۔

"کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ ہونے کی کوشش نہ کروں۔"

چنانچہ جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے، جو قلب کو خدا کی طرف سے پھیر دے سکتے تھے یا نفس میں غرور و تکبر پیدا کر سکتے تھے تو آپ ﷺ نہایت سختی کے ساتھ ان کا انکار فرماتے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گھر میں ایک پردہ لٹکا لیا تھا جس میں تصویریں بنی تھیں آپ ﷺ کی نظر پڑی تو فرمایا:

أُمِيطِي عَنَّا قِرَامَكِ هٰذَا فَانَّهُ لَا تَزَالُ تَصَاوِيرُهُ تَعْرِضُ فِي صَلَاتِي۔ ❶

"ہمارے سامنے سے اپنا یہ پردہ ہٹالو کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں یعنی خلل انداز ہوتی رہتی ہیں۔"

ایک صحابی نے بطور تحفہ کے آپ ﷺ کو حریر کا ایک جُبہ دیا، آپ ﷺ نے اسے پہن کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد نہایت ناگواری سے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا:

لاينبغي هٰذا لِلْمُتَّقِيْنَ۔ ❷

"یہ پرہیز گاروں کے قابل نہیں۔"

## غرور و کبر کا سرچشمہ

غرور و کبر کا سرچشمہ مدح و ستائش ہے۔ امراو سلاطین کو اسی مرض نے دنیا کی تمام چیزوں سے بالاتر بنادیا ہے۔ آنحضرت ﷺ اگرچہ خیر البشر تھے لیکن اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو انبیاے سابقین پر ترجیح دیتا تھا تو آپ ﷺ اسے منع فرماتے تھے۔ ایک صحابی اور ایک یہودی میں جھگڑا ہو گیا۔ صحابی نے غصے میں قسم کھائی اور کہا: اس خدا کی قسم جس نے محمد ﷺ کو تمام دنیا سے افضل بنایا ہے۔ یہودی نے بھی قسم کھائی: "اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام دنیا پر ترجیح دی ہے۔" صحابی نے اس پر غصے میں آکر یہودی کے منہ پر طمانچہ مارا، اس نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ آپ نے حکم دیا کہ "مجھے موسیٰ پر ترجیح نہ دو"❸

## احتساب قبیلہ و خاندان

خیرات گھر ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا تھا: وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿۲۱۴﴾ (اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے آگے حق پیش کرو اور عذاب الٰہی سے

---

❶ بخاری جز: ا ص: ۷۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی ثوب مصلب)
❷ بخاری جز: ا ص: ۸۰ (کتاب الصلوٰۃ باب من صلی فی فروجِ حریر)۔
❸ بخاری جز: ۸ ص: ۱۰۸ (تاب الخصوصات: لا تخیرونی علی موسیٰ)

ڈرا) (الشعرا:۲۱۴) جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے پورے قبیلے اور خاندان کو جمع کر کے پیغمبرانہ لہجے میں یہ حکم الٰہی سنایا؛

"یا معشر قریش! یا معشر بنی عبد مناف! یا معشر بنی قصی! یا معشر بنی عبد المطلب! اے فاطمہ رضی اللہ عنہا محمد ﷺ کی بیٹی، تم سب اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ کیونکہ میں تمہیں قیامت کے دن کچھ بھی نفع و نقصان نہ پہنچا سکوں گا: اے فاطمہ رضی اللہ عنہا تجھے مجھ سے صرف جسمانی تعلق ہے اور میں رشتے کی بیل کو صرف دنیا ہی میں سر سبز و شاداب رکھ سکوں گا" ❶

یہ ایک عام احتساب تھا، لیکن مخصوص مواقع پر بھی آپ ﷺ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور اہل و عیال کو نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے رہتے تھے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ ایک رات اُٹھے اور فرمایا: "سبحان اللہ! آسمان سے فتنہ و فساد کی بارش ہو رہی ہے اور برکات و فضائل کے خزانے کھل گئے ہیں۔ حجروں میں سونے والیوں (ازواج مطہرات) کو جگادو کیونکہ دنیا کی بہت سے کپڑے پہننے والی عورتیں آخرت میں برہنہ نظر آئیں گی"۔ ❷

## صدقے سے اجتناب میں اہتمام

آپ ﷺ نے تنزہ نفس اور استغنا کی وجہ سے فقر و فاقہ کے باوجود اپنے اوپر اور اپنے تمام خاندان کے اوپر صدقہ حرام کر دیا تھا۔

امام حسین رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ بچپن میں صدقہ کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی آپ ﷺ کی نگاہ پڑی تو فوراً ٹوکا: "کخ کخ"، کیا تمہیں خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا؟" ❸

آپ ﷺ ایک مرتبہ شب کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا: "تم لوگ اٹھ کر تہجد نہیں پڑھتے؟" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "یارسول اللہ ﷺ! ہماری نیند اور بیداری تو خدا کے اختیار میں ہے، اگر وہ جگائے گا تو جاگیں گے؟ آنحضرت ﷺ خاموش ہو گئے مگر اپنی ران پر افسوس کے ساتھ ہاتھ مارا اور یہ آیت پڑھی:

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ ❹ (الکہف۔۵۴)

"آدمی بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔"

---

❶ ترمذی ص ۵۲۶ کتاب التفسیر
❷ بخاری جز: ۲ ص: ۳۰۔
❸ بخاری جز: ۲ ص: ۱۲۸
❹ بخاری جز اول ص: ۵۰

## احتساب قوم

اگرچہ وہ تمام جزئی مواقع، جہاں آنحضرت ﷺ نے احتساب کا فرض ادا کیا ہے، احتساب قومی کے تحت میں داخل ہیں، لیکن آپ ﷺ نے دو موقعوں پر نہایت بلیغ تشبیہ کے ساتھ اپنی اس خصوصیت کا اظہار قوم کے سامنے فرمایا: ایک موقع پر فرمایا:

”میری اور میری شریعت کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہے، جس نے ایک قوم کے پاس آکر یہ وحشت انگیز خبر سنائی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر تمہاری طرف آتے ہوئے دیکھا ہے، میں ایک ”نذیر عریاں“ ہوں، ❶ پس تمہیں ہوشیار ہو جانا چاہیے چنانچہ ایک گروہ نے اس کا کہنا مانا اور وہ رات ہی رات بچ کر نکل گیا۔ دوسرے گروہ نے اسے جھٹلایا: نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر نے دھارا مارا اور اس گروہ کا استیصال کر دیا“۔

دوسرے موقعے پر فرمایا:

”میری اور تمام لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ بھڑکائی۔ جب آگ کی روشنی چاروں طرف پھیلی تو پروانے اس پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ اس نے پروانوں کو آگ میں جانے سے روکنا چاہا، لیکن وہ سب اس کے قابو میں نہ آسکے اور آگ میں گھس گئے۔

”اسی طرح میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر کھینچتا ہوں تاکہ آگ میں داخل ہونے نہ پاؤ، لیکن لوگ اس میں گھسے جاتے ہیں۔“❷

## عقائد کی درستی

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد تصحیح عقاید تھا۔ عقائد میں بدترین چیز شرک فی اللہ تھی اور آنحضرت ﷺ نے صرف شرک ہی مٹانے کے لیے جہاد کیا، جو احتساب کی آخری منزل ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عقائد ہیں، جو عام دسترس سے باہر ہیں۔ اگر عام لوگوں کو ان میں غور و فکر کرنے کا موقع دیا جائے تو مذہبی عقائد میں بہت سے مفاسد پیدا ہو جائیں اور اسلامی عقائد کی سادگی فنا ہو جائے جو اسلام کا سب سے بڑا زیور ہے۔ اسی غرض سے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی یہ خصوصیت قرار دی تھی کہ وہ غیر ضروری چیزوں میں وقت ضائع نہیں کرتے، چنانچہ عہد نبوت میں جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے سختی کے ساتھ صحابہ کو زجر و توبیخ کی ہے۔

### مسئلہ قضا و قدر

---

❶ یعنی ننگا ڈرانے والا۔ عرب میں ہر اہم واقعے کی خبر ننگے ہو کر دیتے تھے۔

❷ بخاری جز: ۸ ص ۱۰۱۔ ۱۰۲۔

ایک مرتبہ صحابہ مسئلہ قضاوقدر کے متعلق مباحثہ کررہے تھے جس نے آگے چل کر مسلمانوں کے دو عظیم و حریف مقابل فرقے پیدا کردیے [1] آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو چہرہ مبارک غصے سے سُرخ ہوگیا اور فرمایا:

بھٰذا امرتم او لھذا خلقتم تضربون القراٰن بعضہ بعضا بھٰذا اھلکت الامم قبلکم [2]

"کیا تم لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے یا تم اس لیے پیدا کیے گئے ہو؟ تم لوگ قرآن کو گڈمڈ کررہے ہو، گزشتہ قوموں کو اسی قسم کے لایعنی مسائل نے برباد کردیا۔"

## چاند سورج کا گہن

اگرچہ اسلام نے عرب جاہلیت کے تمام توہم آمیز عقائد مٹادیے تھے، تاہم بعض باتیں رہ گئی تھیں اور کبھی کبھی ان کا ظہور ہوجاتا تھا۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے صاحب زادے ابراہیم رضی اللہ عنہ نے انتقال کیا تو اتفاق سے اسی دن سورج میں گہن بھی لگ گیا۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کا اثر ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے فوراً اس خیال سے لوگوں کو روکا اور فرمایا: "چاند اور سورج میں کسی کے مرنے اور جینے سے گہن نہیں لگتا۔"

## عبادات

عبادات چونکہ روز کی چیزیں تھیں جن میں سہو و غفلت اور بے عنوانی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کو ان کے متعلق احتساب کی اکثر ضرورت پیش آتی تھی، [3] اسلام نے ادائے نماز کے لیے جماعت کو واجب کردیا تھا، لیکن اکثر لوگ اس میں غفلت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے جماعت میں چند اشخاص کو ڈھونڈا تو نہ پایا، نہایت برہم ہوئے اور فرمایا:

"جی میں آتا ہے کہ ایک شخص کو امام بنا کر خود ان لوگوں کے پاس چلا جاؤں اور لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر ان کے گھر آگ میں پھونک دوں"۔ [4]

---

[1] یعنی جبری اور قدری

[2] سنن بن ماجہ ۱۶ (باب القدر)

[3] بخاری جز: ۲ ص ۳۴۔

[4] صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد: ۱ ص: ۲۴۳

## نماز میں تخفیف کی تاکید

بعض لوگ جب امامت کرتے تھے تو نماز میں طول دیتے تھے، جس سے کاروباری اور ضعیف لوگ گھبرا جاتے تھے۔ ایک شخص نے اسی بنا پر امام کی شکایت کی، آپ ﷺ کو معمول سے زیادہ غصہ آگیا اور فرمایا:

"تم مذہب سے لوگوں کو متنفر کر رہے ہو۔ امام کو نماز میں تخفیف کرنی چاہیے کیونکہ ان میں مریض، ضعیف، کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ [1]

## خشوع فی الصلوٰۃ

نماز کا اصل مقصد خشوع و خضوع ہے لیکن جب کسی کے طرزِ عمل سے ان کا ظہور نہیں ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ اسے تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے نہایت عجلت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز پڑھ چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "نماز کو دہراؤ، تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔" اس نے تین بار نماز دہرائی اور آپ ﷺ نے تینوں بار ٹوکا، آخر میں اس نے کہا "اب میں اس سے بہتر نماز نہیں پڑھ سکتا۔" آپ ﷺ نے تکبیر، قرات، رکوع، سجود، قیام اور تعوذ کے وہ طریقے بتائے جن سے اطمینان، سکون و قار اور اعتدال کا اظہار ہوتا تھا۔ [2]

## جزئیات پر نظر

عبادات اور مقدمات، عبادات کے متعلق آپ ﷺ نہایت معمولی اور جزئی باتوں پر بھی گرفت فرماتے تھے۔ ایک بار سفر میں تھے، نماز عصر کا وقت آگیا، صحابہ نے پاؤں کا مسح کیا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو دور سے بہ زور آواز دی۔

ویل للاعقاب من النار [3]

"ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔"

ابتدائے اسلام میں نماز کے قیام و ادا کی حالت بالکل ابتدائی تھی اور تمام جزئیات و فروع ابھی واضح نہیں ہوئے تھے، اس طرح کا بتدریج ارتقاء مذہب کی ہر تعلیم میں ہوتا ہے۔ موجودہ حالت ایک مدت کے تغیرات کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابتدا میں اکثر لوگ مسجد کے اندر تھوک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ

---

[1] بخاری جز: ا ص: ۲۶

[2] بخاری جز: ۱۴۸

[3] بخاری جز: ا ص: ۲۷

آپ ﷺ نے مسجد میں تھوک کا دھبا دیکھا، خود اٹھے اور ہاتھ مبارک سے اسے مٹا دیا۔ پھر فرمایا "نماز میں ہر شخص خدا سے سرگوشی کرتا ہے" اس لیے کسی شخص کو قبلہ کی طرف تھوکنا نہیں چاہیے، البتہ دائیں بائیں یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوک سکتا ہے۔ [1]

یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت مسجد کا فرش پختہ نہ تھا، صحن مسجد اور عام سطح زمین میں سوائے حدود عمارت کے اور کوئی امتیاز قائم نہ تھا۔ ریتلی زمین تھی اور وہ ہر طرح کی رطوبت جذب کر لیتی تھی لیکن اب مسجدوں کا داخلی حصہ (ہی نہیں صحن کا فرش بھی) پختہ ہوتا ہے، پس وہاں تھوکنا مسجد کی صفائی اور نمازیوں کے حقوق نشست پر حملہ کرنا ہے۔

## بدعت

نظام مذہبی کا سب سے زیادہ خطرناک مرض بدعت ہے۔ اگرچہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں مسلمان اس مرض میں مبتلا نہیں ہوسکتے تھے تاہم جاہلیت کے زمانے کی بہت سی بدعتوں کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی تھی، اس لیے آپ ﷺ ہمیشہ ان کے مٹانے میں مصروف رہتے تھے۔

## پیدل چلنے کا حلف

بدعت کی مختلف قسمیں اور مختلف مظاہر ہیں لیکن اس کی بدترین شکل رہبانیت اور جوگ ہے، جو یہود و نصاریٰ کے مذہب کا جزو بن گئی ہے۔ وَرَهبَانية ابتدعوها۔ (اور رہبانیت انہوں نے خود نکالی۔ الحدید:۲۸) چونکہ عرب پر یہود و نصاریٰ کا مذہبی اثر غالب تھا اس لئے وہاں بھی اس قسم کی بدعات پیدا ہوگئی تھیں۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا: " اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ ضعف کی وجہ سے بیٹوں کے سہارے چلتا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: " اس نے اپنے آپ کو کیوں عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟ خدا اس سے بے نیاز ہے۔"

## ننگے پاؤں چلنے کی منت

عقبہ بن عامر کی بہن نے خانہ کعبہ تک ننگے پاؤں پیدل چلنے کی منت مانی اور عقبہ کو آنحضرت ﷺ

---

[1] بخاری جز: ا ص:۸۶۔

کے پاس بھیجا کہ پوچھ آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "سواری پر بھی جا سکتی ہے"۔ ❶

## کھڑے رہنا اور بات نہ کرنا

ایک مرتبہ آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور لوگ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر سن رہے تھے لیکن ایک شخص کھڑا تھا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا، اس نے نذر مانی ہے کہ ہمیشہ کھڑا رہے گا۔ سایے میں نہ بیٹھے گا۔ کسی سے بات چیت نہ کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اسے بیٹھنا چاہیے، سایے میں آنا چاہیے، گفتگو کرنی چاہیے اور روزے کو بھی پورا کرنا چاہیے۔ ❷

## ناک میں نکیل

اسی طرح آپ ﷺ کو ایک شخص نظر آیا جسے ایک آدمی ناک میں نکیل ڈال کر خانہ کعبہ کا طواف کرا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی ناک کی رسی کاٹ دی اور فرمایا: "اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔" ❸

## تشدد آمیز مذہبی انہماک

لیکن ان بدعات سے زیادہ ان اصولوں کا مٹانا ضروری تھا جن کی بنا پر بدعات پیدا ہوتی ہیں۔ بدعات کا سب سے بڑا سرچشمہ، تشدد آمیز مذہبی انہماک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے نظام عبادات کو نہایت سہل و آسان طریقے پر قائم کیا ہے، اس لحاظ سے اگرچہ خود اسلام کے سنگ بنیاد پر بدعت کی عمارت قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ تاہم ابتدا میں صحابہ کا ایک پرجوش و مخلص گروہ نہایت شدت کے ساتھ عبادت میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ جب آنحضرت ﷺ نے ایک دن چھوڑ کے روزہ رکھنا شروع کیا تو اکثر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس کی تقلید کی، لیکن آپ ﷺ کو نظر آیا کہ یہی چیز بدعت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اس پر بھی لوگ باز نہ آئے تو معمول کے خلاف متصل روزہ رکھنا شروع کر دیا کہ لوگ خود گھبرا کر باز آ جائیں۔ ❹ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کثرت صوم و صلوٰۃ سے

---

❶ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۰۷۔
❷ بخاری جز ۸ ص ۱۴۳۔
❸ بخاری جز: ۸ ص ۱۴۳۔
❹ بخاری جز: ۸ ص ۱۷۴۔

اسی بنا پر روک دیا تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو بھی شدت زہد سے منع فرمایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تائید کی تھی۔ ❶

## رسم ورواج کا انسداد

رسم و رواج کو جب استحکام ہو جاتا ہے تو بدعات کی طرح ان کا چھوڑنا بھی نہایت شاق گزرتا ہے حالانکہ اکثر حالتوں میں وہ بدعات سے کم ضرر رساں ثابت نہیں ہوتیں اور بڑی قیامت یہ ہے کہ بعض اوقات مذہبی حیثیت پیدا کر لیتی ہیں۔

عرب میں بہت سی مضر رسمیں جاری ہو گئی تھیں، جن کی پابندی نہایت ضروری خیال کی جاتی تھی، اس لیے بدعات کے ساتھ ساتھ ان کا بھی انسداد کیا گیا۔

## میت کا ماتم

عرب کے جذبات نہایت رقیق و لطیف تھے۔ اس لیئے وہ اعزہ و اقارب کی موت سے نہایت متاثر ہوتے تھے۔ جس کا اظہار مختلف حیثیتوں سے کیا جاتا تھا۔ عورتیں نہایت شدت کے ساتھ میت پر گریہ وبکا کرتی تھیں۔ منہ نوچنا، سر کے بال منڈوالینا، گریبان چاک کر دینا، شوہر کی موت پر برسوں تک خاص پابندیوں کے ساتھ گھر سے باہر رہ کر ماتم کرنا عرب کی عورتوں کا عام شعار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام رسوم کو نہایت سختی سے مٹایا۔ شخصی حالتوں کے علاوہ میت پر قومی حیثیت سے بھی ماتم کیا جاتا تھا، یعنی قبیلے کی بہت سی عورتیں جمع ہو کر میت کے محاسن و فضائل بیان کرتیں اور باہم روتی تھیں۔ اسی رسم کا نام "نیاحہ" ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک یہ رسم قائم تھی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آئے تو اس طرح کی عورتوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی۔

## حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب اپنے شوہر کے انتقال کی خبر ملی تو بہ حسرت بولیں "مسافر مسافرت میں مرا۔ اس پر اس قدر گریہ وبکا کروں گی کہ یادگار رہے گا۔" چنانچہ اس غرض سے اٹھیں تو عرب کے دستور قدیم کے مطابق ایک عورت نے گریہ وبکا میں اس کا ساتھ دینا چاہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا: کیا اس گھر میں شیطان کو داخل کرنا چاہتے ہو، جس سے خدا نے اسے نکال دیا ہے؟"۔ ❶

---

❶ بخاری جز ۸ ص ۳۲
❶ صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۰

## حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت

جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی شہادت کی خبر آئی تو ان کی عورتوں نے اسی طریقے سے نوحہ کرنا شروع کیا۔ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کو خبر کی ۔ آپ ﷺ نے منع کرنے کا حکم دیا، لیکن وہ ناکام واپس آیا۔ آپ ﷺ نے اسی غرض سے دوسری مرتبہ پھر اسے بھیجا، اس پر بھی کچھ اثر نہ ہوا تو تیسری بار فرمایا: "جا کر ان عوتوں کے منہ میں خاک جھونک دو۔"❷

## جنازے کے مراسم

جنازے کے متعلق بھی اسی قسم کی متعدد رسمیں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اہل عرب جنازے کے ساتھ سواری پر جاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے چند اشخاص کو دیکھا کہ وہ ایک جنازے کے ساتھ سوار ہو کر جارہے ہیں فرمایا: "کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ فرشتے پیدل ہیں اور تم سواری پر جا رہے ہوا۔"❸

جنازے کی مشایعت صرف کرتہ پہن کر کرتے تھے۔ اظہار غم کے لئے چادر اتار ڈالتے تھے۔ چادر عرب کا عام لباس تھا آنحضرت ﷺ نے اسی وضع میں چند اشخاص کو دیکھا تو فرمایا: "کیا جاہلیت کے طریقے پر عمل کر رہے ہو"۔ ❹

## عورتوں کی شرکت جنازہ

جنازے میں عورتیں بھی عموماً شریک ہوتی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے چند عورتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا: "کیوں بیٹھی ہو:" بولیں: "ایک جنازے کا انتظار ہے۔" فرمایا: "کیا اس کو غسل دو گی؟" ان سبھوں نے کہا: "نہیں" پھر فرمایا: "تو کیا لاش کو کندھا دو گی؟" ان سبھوں نے کہا: "نہیں۔" پھر فرمایا: "کیا لاش کو قبر میں اُتارو گی؟" بولیں: "نہیں"، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر واپس جاؤ۔"❺

## فخر و غرور کی ممانعت

عرب کی فخر پسند طبیعت ہمیشہ باپ دادا کے کارناموں کا ذکر نہایت بلند آہنگی سے علیٰ روس الاشہاد کرتی تھی۔ یہاں تک کہ زمانہ حج میں بھی یہ داستان پارینہ تازہ کی جاتی تھی۔ فَاذْكُرُوا اللهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ

---

❷ صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۵

❸ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۰

❹ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۱

❺ سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷

اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (تو چاہیے کہ جس طرح پہلے اپنے آباواجداد کی بڑائیوں کا ذکر کرتے تھے، اب اسی طرح اللہ کا ذکر کیا کرو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ البقرہ: ۱۹۹) ۔ اس کو "مناشرت" کہتے تھے۔ فخر و غرور کے اظہار کا یہ طریقہ اکثر بڑی بڑی نزاعین قائم کر دیتا تھا۔ اسلام نے اس رسم کو بالکل ہی مٹا دیا، لیکن اس کا اثر مختلف صورتوں میں پھیل گیا تھا منجملہ ان کے ایک صورت یہ تھی کہ باپ دادا کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی قسم کھائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خدا باپ دادا کے نام کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، صرف خدا کی قسم کھانی چاہیے، ورنہ خاموشی بہتر ہے"۔ [1]

## اخلاقی اصلاح

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد اصلاح اخلاق و تزکیہ نفس تھا، جسے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمادیا تھا:

انّما بعثت لاتمّم مکارم الاخلاق۔

"میں اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہُوا ہوں۔"

اور یہ مقصد ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر رہتا تھا۔ اصولی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کے متعلق جو اصلاحیں کیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، جزئی طور پر جب کسی شخص سے کسی قسم کی بداخلاقی کا ظہور ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اسے تنبیہ فرمادیتے تھے۔ چنانچہ احادیث میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، جن کے جزئیات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

## انسداد گداگری

اسلام نے زکوٰۃ کا ایک مستقل نظام قایم کر دیا تھا کیونکہ خاص خاص لوگ اس کے حقیقی مستحق تھے عام طور پر اسلام گداگری اور مفت خوری کو نہایت ذلیل پیشہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیر مستحق لوگوں کو گداگری سے نہایت سختی کے ساتھ روکتے تھے۔

## ایک انصاری کی مثال

ایک مرتبہ ایک انصاری نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "تمہارے گھر میں کچھ پونجی بھی ہے؟" اس نے کہا: ایک ٹاٹ ہے جسے اوڑھتا بچھاتا ہوں۔ ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا

---

[1] سنن ابن ماجہ ص:۳۹۷

ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "جا کر اسے لے آؤ۔" وہ جا کر اٹھا لایا، آپ ﷺ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے بغرض فروخت پیش کیا۔ ایک صحابی نے ایک درہم پر لینا چاہا، دوسرے صحابی نے قیمت میں اضافہ کر کے دو درہم پر لے لیا۔ آپ ﷺ نے دونوں درہم اس انصاری کے حوالے کیئے اور فرمایا: ایک درہم کا غلہ لیکر گھر میں دے آؤ، دوسرے درہم کا ایک بسولا خرید کر میرے پاس لاؤ۔" وہ بسولا خرید لایا۔ آپ ﷺ نے خود دست مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور حکم دیا "جنگل میں جا کر لکڑی کاٹو اور بیچو۔ پندرہ دن تک میں تمہاری صورت نہ دیکھوں۔" وہ لکڑی کاٹ لایا اور اسے فروخت کیا۔ دس درہم ہاتھ آئے یہ رقم لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس رقم سے کُچھ غلہ اور کچھ کپڑا خرید کر کھاؤ پہنو، گداگری سے یہ بہتر ہے۔ وہ تو آدمی کے چہرے کا داغ ہے، صرف اپاہج لوگوں کے لیے جائز ہو سکتی ہے"۔ [1]

## رشوت خوری

عدل و انصاف کی بربادی اور ظلم کی روح خبیث کا سب سے بڑا سبب رشوت خوری ہے۔ عہد نبوت میں چونکہ آنحضرت ﷺ کے فیض محبت سے صحابہ کا معیار اخلاق نہایت بلند ہو گیا تھا اس لیئے رشوت خوری کی مثالیں نہیں ملتیں۔ تاہم جب کبھی کسی کے طرز عمل پر رشوت کا شبہ بھی ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ حکام و عمال کو اکثر رشوتیں نذر و ہدیہ کے ذریعے سے دی جاتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ آپ ﷺ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے واپس آکر آنحضرت ﷺ کے سامنے صدقے کا مال پیش کیا اور کہا: "اتنا مسلمانوں کا مال ہے اور اس قدر مجھے ہدیہ ملا ہے۔" چونکہ اس قسم کا ہدیہ رشوت کا ذریعہ بن سکتا تھا اور اگر علانیہ اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو اور لوگ بھی اس طریقے سے فائدہ اٹھاتے، اس لیے آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا: اس عامل کو دیکھو جو کہتا ہے کہ یہ مال مسلمانوں کا اور یہ مال میرا ہے۔ ذرا وہ اپنے گھر میں تو بیٹھ کے دیکھے کہ اس کے پاس ہدیہ آتا ہے یا نہیں؟ [2]

## خیانت کا انسداد

معاملات میں خیانت، چالاکی اور خدع و فریب کا سب سے زیادہ موقع تجارتی کاروبار میں مل سکتا ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بازار میں سے گزرے اور ایک شخص کے غلے کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کے دیکھا تو نمی محسوس ہوئی چونکہ بھیگنے

---

[1] سنن ابن ماجہ ص: ۳۹۷

[2] صحیح مسلم جلد: ۲ ص: ۱۱۳

سے غلے کا وزن بڑھ جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص دھوکا دیتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"[1]

چونکہ عرب میں غلہ بہت کم آتا تھا اس لیے جب باہر سے سوداگر غلہ لاتے تھے تو لوگ شہر سے باہر ہی تخمیناً خرید لیتے تھے، لیکن اس سے کئی طرح کے نقصانات پیدا ہوتے تھے۔ اول تمام شہر محروم رہ جاتا تھا، دوسرے یہ ایک غیر معین و غیر معلوم بیع تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے روکا۔ آپ ﷺ لوگوں کو عموماً اس پر سزا دیتے تھے۔[2]

## حفظ الید و حفظ اللسان

اسلام نے ایک عظیم الشان اخلاقی اصول یہ قائم کیا تھا۔

المسلم من سلم المسلمون من یدہ و من لسانہ۔

"مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچے۔"

اگرچہ اس اصول کی خلاف ورزی کا اثر ہر موقع پر بُرے نتائج پیدا کرتا ہے، تاہم برابر کے درجے کے لوگ انتقام لیکر اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں، کمزور انسانوں کو تو اس کا بھی موقع نہیں مل سکتا چنانچہ اس قسم کے موقعوں پر جب کوئی شخص اس اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تھا تو آپ ﷺ فوراً ٹوک دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے غلام کو ماں کی گالی دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم اس کو گالی دیتے ہو؟ تم میں زمانہ جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، جنہیں خدا نے تمہارے سپرد کر دیا ہے، جو تم کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو تم پہنو، وہی ان کو پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو۔ اگر لیتے ہو تو ان کی اعانت کرو۔[3]

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ انصاری کہتے ہیں: "میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ یکایک پیچھے سے ایک آواز آئی، اے ابو مسعود رضی اللہ عنہ! ہوشیار! خدا کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے"۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے۔ حضرت مسعود رضی اللہ عنہ پر اس کا یہ اثر پڑا کہ انہوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔[1]

## مداحی اور عیش پروری کا انسداد

---

[1] سنن ابن ماجہ ص: ۴۰۳

[2] بخاری جز: ۳ص: ۶۸

[3] بخاری جز: ۱ص ۱۱

[1] ابوداؤد ص: ۳۴۸ جلد: ۲ (باب فی حق المملوک)

انسان خوشامد پسند ہے اور مداحی اس دبی ہوئی چنگاری کو اور بھی ابھار دیتی ہے امراو سلاطین کو اسی نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو خود مدح سے نفرت تھی اور لوگوں کو بھی اس سے منع فرماتے تھے، چنانچہ ایک آدمی نہایت مبالغہ آمیز طور پر ایک شخص کی مدح کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا۔ "تم نے اسے ہلاک کر دیا❷"

عیش پرستی بظاہر تمدن کا زیور ہے، لیکن در حقیقت اس کے اندرونی نظام کا اصلی گھن یہی چیز ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپ ﷺ تمام لوگوں کو اسی سادگی کی تعلیم دیتے تھے اور جب کبھی کوئی چیز اس کے خلاف نظر سے گزرتی تو اس سے بیزاری ظاہر فرماتے تھے۔

## ضرورت سے زائد عمارت

ایک مرتبہ آپ ﷺ راستے سے گذرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کس کا مکان ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام لیا۔ آپ ﷺ خاموش ہو گئے، لیکن دل میں بات رکھ لی۔ وہ انصاری آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے آنحضرت ﷺ کی ناراضگی کا سبب پُوچھا تو لوگوں نے واقعہ بیان کیا۔ وہ فوراً گئے اور اس مکان کو مہندم کر دیا۔ آپ ﷺ دوسری بار اس طرف سے گزرے تو فرمایا کہ وہ عمارت کیا ہو گئی: لوگوں نے کہا یارسول اللہ ﷺ صاحب خانہ نے آپ ﷺ کی ناراضگی کے خوف سے اس کو گرادیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ گھر جو ضرورت سے زائد ہو، صاحب خانہ پر وبال ہے۔ ❸

## آرائشی پردے

ایک مرتبہ آپ ﷺ کسی لڑائی سے واپس آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شوق و محبت کے ساتھ گھر کو ایک نہایت رنگین پردے سے سجایا۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سلام کیا، لیکن آپ ﷺ کے چہرے سے ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے اور سلام کا جواب تک نہ دیا۔ پھر خود دست مبارک سے پردے کے دو ٹکڑے کر دیے اور فرمایا کہ خدا نے ہمیں مٹی اور پتھر کو آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ ❶ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی اس قسم کے مواقع پیش آئے ہیں۔

---

❷ بخاری جز: ۳ص:۱۷۷

❸ ابوداؤد جلد: ۲ص ۳۵۶ (کتاب الادب، باب ماجاًفی النہا)

❶ ابوداؤد ص: ۲۱۶ جلد:۲

## عفت وعصمت

اسلام پاکبازی اور عفت کی تعلیم دینے کے لیئے آیا تھا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ (المؤمنون۔۵)

"کامیاب مسلمان وہ ہیں جو عفیف اور پاکباز ہیں۔"

اس بنا پر جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے جن سے مسلمانوں کی اس خصوصیت پر حرف آسکتا تھا، تو آنحضرت ﷺ فوراً اس سے تعرض فرماتے تھے۔

حضرت فضل رضی اللہ عنہ بن عباس رضی اللہ عنہ نہایت وجیہ آدمی تھے۔ زمانہ حج میں آنحضرت ﷺ نے انہیں اپنے ساتھ سوار کرلیا تھا۔ ایک خوش رو عورت آنحضرت ﷺ کی طرف فتویٰ پُوچھنے کے لیے بڑھی۔ فضل رضی اللہ عنہ نے اس کو پر شوق نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ آنحضرت ﷺ نے خود دست مبارک سے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر منہ اس کی طرف سے پھیر دیا۔ [2]

## ستر عورت کی تاکید

یورپ کو آج تہذیب و تمدن پر بڑا ناز ہے۔ اگرچہ یورپ کی اخلاقی حالت کے اصلی مناظر نہایت نفرت انگیز ہیں۔ بظاہر ہر انگریز کو ستر عورت کا خیال رہتا ہے اور کسی نے کسی انگریز کو راہ میں برہنہ تن بہت کم دیکھا ہوگا۔ لیکن اسلام کی تہذیب اس بارے میں صرف نمائشی لباس آرائی ہی کو کافی نہیں سمجھتی۔ ایک بار آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو میدان میں برہنہ نہاتے ہوئے دیکھا، فوراً منبر پر تشریف لائے اور ایک عام خطبہ دیا:

"خدا صاحبِ حیا کو پسند کرتا ہے پس تم میں سے جو کوئی غسل کرے، چاہیئے کہ پردہ ڈال لیا کرے"۔ آنحضرت ﷺ کو ستر عورت کا اس قدر خیال تھا کہ ایک مرتبہ مِسوَر بن مَخرَمہ نے ایک بھاری پتھر اٹھایا۔ اس حالت میں ان کا کپڑا گر گیا۔ آپ ﷺ نے فوراً ٹوکا کہ کپڑا اٹھاؤ۔ برہنہ نہ ہو۔ [3] لیکن یورپ کی ستر پوشی کا یہ حال ہے کہ غسل خانوں، حماموں، بحری ساحلوں اور تیراکی کے حوضوں میں صدہا متمدن انسان برہنہ ہو کر ایک دُوسرے کے سامنے نہاتے ہیں!

## اصلاح شؤن النساء

اس معاملے میں عورتوں کی حالت مختلف حیثیتوں سے قابل توجہ اور محتاج اصلاح تھی۔ عرب میں مخنثوں کا ایک گروہ موجود تھا، جو علانیہ گھروں میں آتا جاتا تھا۔ ایک بار ایک مخنث نے ازواج مطہرات

---

[2] بخاری جز: ۸ ص: ۵۱

[3] ابوداؤد جلد: ۲ ص: ۲۰۱

رضی اللہ عنہن کے سامنے ایک عورت کے محاسن بلکل ایک مرد کی نظر و ذوق سے بیان کیے۔ آنحضرت ﷺ نے فوراً حکم دیا کہ یہ لوگ گھر میں نہ گھسنے پائیں۔ [1]

عرب کی عورتوں میں جو بد اخلاقیاں پھیل گئی تھیں ان میں ایک بداخلاقی یہ بھی تھی کہ بعض عورتیں مردوں کی وضع اختیار کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان پر عموماً لعنت بھیجی ہے۔ جب کبھی کسی عورت کی وضع کو مردوں سے بلاقصد بھی مشابہت ہو جاتی تو آپ ﷺ فوراً ٹوک دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا دوپٹہ اوڑھ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا:

لیۃ لالیتین "ایک تہہ کر کے اوڑھو، دو تہہ نہ کرو۔"

کیونکہ دو تہہ کرنے سے عمامہ کے ساتھ مشابہت پیدا ہو جاتی، جو مردوں کی خاص وضع ہے۔ آپ ﷺ کو اس پر اس قدر اصرار تھا کہ ایک عورت نے پردے سے آپ ﷺ کو ایک خط دینا چاہا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی نہ تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟" اس نے کہا "میں عورت ہوں۔" فرمایا: "اگر تم عورت ہو تو مہندی لگاؤ۔"

## غیر محتاط لباس کی ممانعت

اکثر عورتیں نہایت غیر محتاط لباس پہنتی تھیں۔ اس کے متعلق قرآن حکیم میں آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ جب کبھی اس قسم کی بے احتیاطی ملاحظہ فرماتے تھے تو فوراً روک دیتے تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بن ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس ایک کپڑا پہن کے آئیں تو آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا پھر فرمایا۔ "عورت بلوغ کے بعد صرف منہ اور ہاتھ کھلا رکھ سکتی ہے۔" [2]

عورتیں عموماً راستوں میں مردوں کے دوش بدوش چلتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ مسجد سے نکلے تو دیکھا کہ مرد عورت دونوں ساتھ ساتھ راہ میں چل رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تم کو درمیان راہ چلنے کا کوئی حق حاصل نہیں، راستے کے کنارے چلنا چاہیے"۔ اس کے بعد سے عورتیں دیواروں سے لگ کر چلنے لگیں۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

## اصلاح ذات البین

اسلام نے مسلمانوں پر سب سے بڑا احسان الٰہی یہ جتایا ہے:

فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا (آل عمران:۱۰۳)

---

[1] مسلم جلد: ۲ ص: ۲۴۴

[2] ابو داؤد جلد ۲ ص:۲۱۱

”خدا نے تم کو باہم دشمنی کے بعد بھائی بھائی بنادیا۔“

لیکن باہمی اختلاف و تنازع سے یہ رشتہ اخوت ٹوٹ سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کے فرائض احتساب میں سب سے اہم فرض رفع نزاع تھا۔ چنانچہ جب کبھی آپ ﷺ کو کسی شر وفساد خانگی کی خبر ملتی تو آپ ﷺ جاتے اور اصلاح فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں باہم کچھ ناچاقی پیدا ہوگئی ہے۔ آپ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور معاملے کے سلجھانے میں اس قدر دیر لگی کہ نماز کا وقت آگیا۔ چنانچہ حضرت بلالؓ کے درخواست کرنے پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔ [1]

عبد اللہ بن ابیّ بن سلول ایک بار نہایت گستاخانہ پیش آیا۔ یہاں تک کہ صحابہ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ لڑنے بھڑنے پر تیار ہوگئے، اس پر عبد اللہ بن ابیّ کے حامی بھی اُٹھے اور فریقین باہم دست و گریبان ہوگئے، لیکن آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو سمجھا بُجھا کر الگ کیا اور فرمایا کہ ”صلح فساد سے بہتر ہے۔ [2]“

واقعہ افک کے متعلق خود مسلمانوں کے دو قبیلوں اوس و خزرج میں سخت نزاع قائم ہوگئی اور دونوں فریق آمادہ جنگ ہوگئے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

## مراعات ادب

آنحضرت ﷺ کو بڑوں کے ادب و تعظیم کا نہایت خیال رہتا تھا۔ معمولی باتوں پر بھی گرفت کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود کے چھوٹے بیٹے نے گفتگو میں سابقت کرنی چاہی تو آپ ﷺ نے فوراً ٹوک دیا:

الکبر الکبر ”یعنی پہلے بڑے کو بولنے دو۔ [3]“

## اخلاقی احکام

سچ یہ ہے کہ اخلاقی احکام کا تعلق جہاں تک تعلیم محض سے ہے، وہ کوئی ایسی متاع غریب نہیں جس کے پیش کرنے پر اسلام فخر کرے۔ اخلاقی احکام ہمیں ہر جگہ مل سکتے ہیں اور قریباً ہر مذہب نے اپنا مقصد یہی بتلایا ہے کہ انسان کو اخلاق کا وعظ سنائے۔ اگر قرآن حکیم تعلیم دیتا ہے کہ عہد و مواثیق کی پابندی کرو

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص: ۲۱۸

[2] ابوداؤد جلد ۲ ص:۲۱۱

[3] ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۶۰

تو قوانین موسوی اور ضابطہ ناصری بھی یہ نہیں کہتا کہ عہد باندھ کر توڑ ڈالو۔ حتیٰ کہ آریائی نسل کی وہ فلسفیانہ روحانیت بھی جس نے ہندوستان اور ایران میں ظہور کیا، اپنی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شاخ کے اندر اخلاقی تعلیمات واحکام سے لبریز ہے۔

پس اصلی چیز تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے نتائج اور اس کا عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا، اس نے عملی شکل میں کیسی صورت اختیار کی؟ انسان کی رُوح اس لیے بیمار نہیں کہ زبانوں نے تعلیم کم کر دی اور کاغذوں پر زیادہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا اصل دُکھ زندگی کی عملی مشکلات میں ہے اور صرف وہی تعلیم فتحمند ہو سکتی ہے، جو ایک مستحکم عملی نمونہ اپنے ساتھ رکھتی ہو۔

عملی حقیقت کے لحاظ سے اوّلین نمونہ حامل قرآن واوّلین داعی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔۲۱)

یہاں ہم صرف اسی حیثیت سے اسلامی مواثیق وعہد پر نظر ڈالیں گے۔

## جنگ و صلح کی متضاد حالتیں

جنگ و صلح کی متضاد حالتوں میں انسان کا نظام اخلاق دفعتہ بدل جاتا ہے۔ ایک شخص بہ ذاتِ خود نہایت رحم دل ہے لیکن میدان جنگ میں جا کر نہایت بے رحم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ذاتی معاملات میں نہایت حلیم الطبع ہے، لیکن کسی فوج میں شامل ہو کر سخت مشتعل اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے۔ ایک شخص امن و صلح کے زمانے میں نہایت صادق العقول اور پابند عہد ہے، لیکن زمانہ جنگ میں اتنا ہی خراع اور عہد شکن بن جاتا ہے۔ ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک، امن و سکون کے دور میں انسانیت کا بہتر سے بہتر نمونہ ہوتا ہے لیکن جنگی اغراض، طامعانہ اقدامات اور حربی مصالح کے عہد فساد میں آکر چارپایوں سے زیادہ وحشی اور درندوں سے زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝[1] اسی بنا پر بعض حکماء کا قول ہے کہ "سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی"۔

لیکن دنیا میں صرف "اسلام" ہی ایک ایسی زندہ ہستی ہے جو اپنے پہلو میں دل اور دل میں ایک غیر ممکن التغیر اخلاقی طاقت رکھتی ہے۔ اس پر عوارض خارجیہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، ظاہر وباطن، شخصیت وجمہوریت، افتراق واجتماع، جنگ و صلح، اس کے لیے تمام حالتیں یکساں ہیں۔ اس کا معیار اخلاق جس طرح امن و صلح کی حالت میں قائم رہا، اسی استحکام واستواری کے ساتھ جنگ کے سیلاب اور آتش وخون کے طوفان میں بھی قائم وثابت نظر آیا۔

---

[1] بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا، پھر اسے بد سے بدتر حالت میں پھینک دیا۔ (التین: ۴۔۵)

پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زندگی اعمال انسانیت کی ہر شاخ پر حاوی تھی۔ اس میں حق و صداقت کے آغاز کی غربت و مظلومی بھی تھی اور تمام کی فتح مندی و کامرانی کا جاہ و جلال اور سطوت و جبروت بھی تھا۔ انہوں نے امن و صلح کے ایّام بھی کاٹے اور امن و صلح کے لیے جنگ کی تلوار باندھنے کا حکم بھی دیا۔ اس لیے عہد و میثاق اور ان کے نتائج و عواقب کے واقعات عہد نبوت کی تاریخ میں بے شمار نظر آتے ہیں اور ان کے اندر اخلاق قرآنی کی عملی صورت دیکھی جاسکتی ہے۔

## ظالم دشمنوں سے سلوک

سب سے پہلی چیز اس سلسلے میں وہ اخلاقی سلوک ہے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے غیر قوموں اور حریفانِ جنگ سے کیا۔ ان قوموں نے معاہدوں کو اکثر توڑا ہے اور نہایت شرمناک طریقے سے غداریاں کی ہیں۔

رعل، ذَکوان، عُصَّیہ اور بنولِحیان کے قبائل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی دشمن کے مقابلے کے لیے فوجی مدد کی درخواست کی۔ [1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قراء صحابہ میں سے ستّر صحابی ساتھ کر دیے لیکن بئر معونہ پر لے جا کر ان لوگوں نے بیوفائی کی اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیا۔

جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی فوج کو قبیلہ بنولِحیان کے دو سو تیر اندازوں نے گھیر لیا تو ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ نیچے اتر آئیں تو کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس پر ایک جماعت اتر آئی، لیکن بعض صحابہ کو اسی جگہ قتل کر دیا گیا اور بعض کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ [2]

## ذاتی وفائے عہد

بہ ایں ہمہ غدر و بے وفائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معیار اخلاق شخصی حالتوں میں تھا، وہی میدانِ جنگ میں بھی قائم رہا۔ شخصی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفائے عہد کا یہ حال تھا:

---

[1] واقعہ یوں ہے کہ قبیلہ کلاب کے رئیس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ چند لوگ میرے ساتھ کر دیجیے جو میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نجد کی طرف سے مطمئن نہیں۔ رئیس کلاب نے نجد کی طرف سے ذمہ داری اٹھالی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی بھیج دیے۔ رئیس کلاب نے بئر معونہ پہنچ کر غداری کی۔ آس پاس کے قبائل مثلاً رعل، عصیہ، ذَکوان کے پاس آدمی دوڑائے کہ تیار ہو کر آؤ۔

[2] یہ واقعہ رجیع ہے جس میں عضل اور قارہ کے قبیلوں نے تعلیم اسلام کی غرض سے چند آدمی طلب کیے تھے اور دس آدمی بھیجے گئے تھے جن کا رئیس حضرت عاصمؓ بن ثابت کو مقرر کیا گیا۔ ان قبیلوں نے بھی غداری کی۔

عن عبد اللہ بن ابی الحمساء قال بایعت النبی ﷺ ببیع قبل ان بعث، و بقیت له بقیة فوعدته ان اٰتیه بها فی مکانه فنسیت فذکرت بعد ثلاث فجئت، فاذا هو فی مکانه، فقال یافتی لقد شققت علیّ انّا ھٰھنا منذ ثلاث انتظرك۔ ❶

"عبد اللہ بن حمساء کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ ان کے مبعوث ہونے سے پہلے میں نے ایک چیز فروخت کی، جس کا کچھ حصہ آپ ﷺ کے حوالے نہیں کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آپ ﷺ ٹھہریے۔ میں اسی جگہ لے کے آتا ہوں مگر میں گھر جا کر بُھول گیا اور تین دن کے بعد اپنا وعدہ یاد آیا، پلٹ کے آیا تو دیکھا کہ آپ ﷺ اسی جگہ ہیں۔ آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ تم نے مجھے بڑی تکلیف دی۔ میں تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

## مجاہدین کو وصّیت

جہاد اسلامی کی وسعت نے آپ ﷺ کی اخلاقی طاقت کو اور بھی مستحکم و استوار کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جب مجاہدین جہاد کے لیے روانہ ہوتے تو آپ ﷺ ان کو مخاطب کر کے ایک عام وصّیت فرماتے جو متعدد اخلاقی ہدایات کا مجموعہ ہوتی تھی۔ انھی ہدایات میں ایک حکم پابندی عہد کا بھی تھا:

کان رسول اللہ ﷺ اذا امّر امیرا علی جیش اوسریة اوصاه خاصة بتقوی اللہ عزوجل ومن معه من المسلمین خیرا، ثم قال اغزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ۔ قاتلوا من کفر باللہ اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا۔ ❷

"آنحضرت ﷺ جب کسی شخص کو کسی فوج کا سپہ سالار مقرر فرماتے اسے خدا سے ڈرنے اور مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتے۔ پھر فرماتے کہ خدا کی راہ میں خدا کا نام لے کر لڑو! جن لوگوں نے خدا کا انکار کیا ہے ان سے جہاد کرو لیکن مال غنیمت میں کسی قسم کی خیانت نہ کرنا، عہد کی پابندی کرو، بیوفائی نہ کرو، کسی کے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک نہ کاٹو! بچوں کو قتل نہ کرو۔"

مجاہدین عموماً ان احکام پر عمل کرتے تھے اور یہی اخلاقی ہدایت تھی جو ان کو ہر قسم کے بے اعتدالانہ جنگی افعال سے روکتی تھی۔

## حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ

لیکن ان ہدایات میں پابندی عہد پر مسلمانوں نے جس شدت کے ساتھ عمل کیا، اس کی نظیر دنیا کی

---

❶ (ابو داؤد جلد: ۲ صفحہ: ۳۲۶ کتاب الادب)

❷ (صحیح مسلم جلد: ۲ ص: ۶۲ کتاب الجہاد)

اخلاقی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ حضرت خُبَیب رضی اللہ عنہ اور ابن دشنہ کو قبیلہ بنی لحیان نے امان دے کر پہاڑ سے اتروایا، [1] پھر بد عہدی کی اور انہیں غلام بنا کر بیچ ڈالا، عام طور پر جب نقض عہد میں ایک فریق کی طرف سے پیش قدمی کی جاتی ہے تو دوسرا فریق ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور تمام معاہدوں کو توڑ سکتا ہے۔ اس لیے خُبیب رضی اللہ عنہ اگر اس وقت ان ہدایات کی پابندی نہ کرتے تو وہ معذور سمجھے جا سکتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام جبری احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی اثر ان کو مجاہدین کے رگ وپے میں ساری کر دیتا تھا۔ جب خُبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر نے خرید لیا اور حرم کے باہر قتل کرنا چاہا تو انہوں نے حارث کی لڑکی سے استرا طلب کیا۔

لڑکی نے استرا ان کے ہاتھ میں دینا چاہا تو حضرت خُبَیب رضی اللہ عنہ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اتفاقیہ بچی کی ماں آ گئی ڈری کہ جو شخص جان سے ہاتھ دھو چکا ہے اسے کسی کی جان پر حملہ کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ جان سے ہاتھ دھو چکے تھے اور ہاتھ میں ایک ہتھیار (استرا) بھی تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے قتل نہ کرنے کا جو عہد ان سے لے لیا تھا، وہ انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا چنانچہ ماں کی سراسیمگی دیکھ کر اس سے کہا: کیا تم کو ڈر ہے کہ میں اس بچی کو قتل کر دوں گا! نہیں، تم ایسا نہ سمجھو۔ میں ایک بچے کا خون اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔ [2]

ان اخلاقی احکام سے زیادہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو پابندی عہد کی تعلیم دی تھی۔ یہود خیبر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دے دیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قسم کا انتقام نہ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں نے جادو کیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کی بنا پر انہیں معاف کر دیا۔

## حُدیبیہ کے بعد کا ایک واقعہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کفّارِ مکہ سے بمقام حُدیبیہ صلح کر لی تو صلح کے بعد مسلمانوں اور کافروں میں باہم میل جول ہو گیا۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

میں اس حالت اطمینان میں ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ اتفاق سے میرے پاس چار مشرک آ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مذمت کرنے لگے۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو نہ سن سکا اور اٹھ کر دوسرے درخت کے سایے میں چلا گیا۔ وہ سب درخت کی شاخ میں ہتھیار لٹکا کر لیٹ گئے، اس حالت میں دفعتہً غل ہوا کہ ابن زنیم قتل کر دیا گیا۔ میں نے تلوار میان سے کھینچ لی اور انھی چاروں پر حالتِ خواب میں حملہ کیا

---

[1] یہ واقعہ رجیع کا ایک حصہ ہے۔ رجیع عسفان اور مکہ مکرمہ کے وسط میں ایک مقام ہے۔

[2] بخاری جزو: ۵

پہلے ان کے ہتھیاروں پر اچھی طرح قبضہ کر لیا پھر ان سے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو برگزیدہ کیا ہے تم میں سے جو شخص سر اٹھائے گا اس کی گردن اڑادوں گا۔ پھر ایک طرف سے میں ان چاروں کو اور دوسری طرف سے میرے چچا عامر ایک دوسرے کافر کو جس کا نام مِکرَز تھا، گھسیٹتے ہُوئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں بالکل معاف کر دیا اور فرمایا: انہیں چھوڑدو، برائی کی ابتدا انہی کی طرف سے ہونی چاہیئے۔ [1]

اگر آنحضرت ﷺ انہیں قتل کر دیتے تو در حقیقت اس بدعہدی کے ذمہ دار خود وہی لوگ ہوتے، لیکن آپ ﷺ نے نقضِ عہد کی اس ظاہری شکل کو بھی گوارانہ کیا، جو ان کے اقدام قتل سے پیدا ہوتی تھی۔

## احکام شریعت کے تین درجے

اسلام نے احکامِ شریعت کے تین درجے قرار دیے ہیں:

الحلال بیّنٌ والحرام بیّنٌ وما بینھما مشتبھات۔ (الحدیث)

”حلال بھی کھلا ہُوا ہے اور حرام بھی، البتہ ان کے درمیان چند مراتب ایسے ہیں جو حلت و حرمت دونوں کا احتمال رکھتے ہیں۔“

یہی مشتبہات در حقیقت زہد و تقویٰ کی آزمایش ہیں۔ ایک خداترس شخص ایک کھلی ہوئی نیکی پر عمل کر سکتا ہے، ایک فریبی دکھلاوے کے لیے کسی صریح برائی سے اجتناب کر سکتا ہے، لیکن نیتوں کا کھوٹ وہاں نہیں چھپ سکتا جہاں حلال و حرام کے نہایت نازک درمیانی مقامات ہیں۔ تمام حِیَل شرعی انھی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔

## ذاتی انتقام کبھی نہ لیا

آنحضرت ﷺ زہر دینے والے اور سحر کرنے والے یہودیوں کو قتل کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ ان کفار سے بھی انتقام لے سکتے تھے جنھوں نے صُلح حُدیبیہ کے بعد ہجو و غیبت بلکہ کُشت و خون کی طرف قدم بڑھایا۔ بہ ایں ہمہ آپ ﷺ نے انہیں معاف کر دیا، کیونکہ ان بدعہدیوں پر اشتباہ کے متعدد پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان سے ذاتی انتقام کی بُو آتی تھی اور خلق عظیم کے تمام ابوابِ اخلاق میں سب سے زیادہ نمایاں باب یہ ہے کہ:

لم ینتقم لنفسہ۔ (صحیحین) ”آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلا نہ لیا۔“

---

[1] صحیح مسلم جلد:۲

ایسا کرنے سے اگرچہ حقیقی طور پر نقض عہد نہیں ہو سکتا تھا، تاہم بظاہر نقض عہد کا شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اسلام اپنے دامن پر اس قسم کا ظاہری دھبہ بھی نہیں دیکھ سکتا!

## صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اتباع

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے بھی پابندی عہد کا ایک بلند تر معیار قائم کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں ہمیشہ اسے قائم رکھا۔

عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں جب کبھی نقض عہد کا ظاہری احتمال بھی پیدا ہوا تو لوگوں نے علانیہ اس کا انکار کیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے ایک مدت کے لیے معاہدہ صلح کر لیا تھا۔ وہ اگرچہ نقض عہد کرنا نہیں چاہتے تھے، تاہم انہوں نے زمانہ صلح ہی میں رومیوں سے لڑنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں اور فوج لے کر ان کی طرف بڑھے کہ مدت صلح گزر جانے کے ساتھ ہی جنگ شروع کر دیں گے۔ اسی حالت سفر میں ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا اور کہا: اللہ اکبر! اللہ اکبر! کیا یہ بدعہدی تمہارے شایان شان ہے؟ تم کو وفائے عہد کرنا چاہئے۔ لوگوں نے تعجب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عمر رضی اللہ عنہ بن عنبسہ ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور ان سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من کان بینه و بین قوم عهد فلا یشدّ عقدة ولا یحلها حتّٰی ینقضی احدها او ینبذ الیهم علٰی سواء۔

”اگر کوئی شخص کسی قوم سے معاہدہ کرے تو اس معاہدے کی گرہ نہ باندھے اور نہ کھولے (یعنی اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے اور اسے اپنے حال پر قائم رہنے دے، یہاں تک کہ معاہدہ صلح کی پوری مدت گزر جائے یا باہمی معاہدہ کے توڑنے کا عام اعلان کر دیا جائے۔“

چنانچہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ راستے ہی سے لوٹ آئے (ابوداؤد)

## پابندی عہد کا کمال

سلطنتوں میں باہم معاہدے ہوتے ہیں اور وہ قائم بھی رکھے جاتے ہیں، لیکن کوئی سلطنت اپنے معمولی مقاصد کی کامیابی کو بھی عہد وفا کی اخلاقی پابندی پر قربان نہیں کر سکی۔ یورپ کا موجودہ اخلاق اس کے لیے کافی شہادت ہے۔ اٹلی نے اپنے عالم آشکار عہد کو چند لمحوں کے اندر فراموش کر دیا[1] اور جرمنی پیرس کی طرف بڑھنے کو اس قدر ضروری سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے بیلجیم کی ناطر فداری کوئی شے نہیں۔[1] اسلام کا مقصد پیرس کے قلعوں کی برجیوں سے زیادہ بلند تھا، لیکن اس نے پابندی عہد پر اپنے عظیم

---

[1] مطلب یہ کہ اٹلی کا معاہدہ جرمنی اور آسٹریا سے تھا مگر پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء) میں وہ اپنے حلیفوں کو چھوڑ کر برطانیہ و فرانس سے مل گیا۔

[1] پہلی عالمی جنگ میں فرانس پر حملے کے لیے جرمنی کو بیلجیم میں سے گزرنا مناسب معلوم ہوا اور اس نے بیلجیم کی غیر

الشان مقصد کو بارہا قربان کر دیا ہے۔ اسلام کا مقصد حقیقی اشاعت حق تھا، اسی کے لیے وہ لڑتا تھا، اسی کے لیے صلح کرتا تھا، اسی کے لیے معاہدہ کرتا تھا، یہ مقصد کبھی کبھی بغیر کسی قسم کی جدوجہد کے بھی حاصل ہو جاتا تھا اور تلوار کی جگہ صرف داعی اسلام کی روحانی طاقت ہی اس میدان کو فتح کر لیتی تھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ایسے اعلیٰ مقصد کو بھی، جو نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا، معاہدے کی اخلاقی پابندی پر ترجیح نہ دی۔ قریش نے ایک شخص کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں قاصد بنا کر بھیجا۔ وہ آپ ﷺ کی صورت مبارک دیکھتے ہی اسلام کی طرف مائل ہو گیا اور بے اختیار پکار اٹھا "اب اس چوکھٹ کو چھوڑ کر قیامت تک نہ جاؤں گا" لیکن چونکہ قاصدوں کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جاتا اور ان کے ساتھ ایک خاص معاہدے کی پابندی لازمی ہے اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: میں عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ تم سر دست تو واپس جاؤ۔ اگر تمہارے دل میں اسلام کی محبت ہے تو پھر واپس آ سکتے ہو۔ وہ پیغام لے کر گیا، پھر پلٹ کر آیا اور اسلام لایا۔ (ابوداؤد)

## صلح حدیبیہ

مشرکین نے صلح حدیبیہ میں جو شرطیں پیش کی تھیں، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ "کفار مکہ میں سے جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ بھاگ جائے گا، اسے مسلمان واپس کر دیں گے۔" اس شرط پر باہم سخت اختلاف ہُوا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ ایک مسلمان کو کیونکر کفار کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ ابھی اس شرط کا کوئی فیصلہ نہیں ہُوا تھا کہ ابو جَندل رضی اللہ عنہ ابن سہیل بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے مکہ تک پہنچے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے پاؤں پر ڈال دیا۔ ابو جَندل رضی اللہ عنہ کا باپ سہیل تھا اور وہی اس وقت قریش کی طرف سے معاہدے کے لیے آیا تھا۔ سہیل نے کہا کہ میں اپنے بیٹے کی واپسی پر صلح کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تک معاہدہ صلح مکمل نہیں ہُوا۔ اس لیے اس کی پابندی ہمارے لیے ضروری نہیں، مگر اس نے کہا کہ اس کے سوا کسی دوسری بات پر صلح ناممکن ہے۔ آپ ﷺ نے مکرر اصرار کیا کہ کم از کم ابو جندل رضی اللہ عنہ کو تو اس شرط سے مستثنیٰ کر دو، مگر سُہیل نے صاف انکار کر دیا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ نے تمام مسلمانوں سے نہایت درد انگیز لہجے میں کہا کہ "مسلمانو! میں مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ کیا اب پھر مشرکین کی طرف واپس کیا جاؤں گا؟ ان الفاظ نے صحابہ کے مذہبی جذبات میں آگ لگا دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے اختیار انہ اٹھ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ کیا آپ پیغمبر خدا اور آپ کے ساتھی برسرِ حق نہیں؟ آپ ﷺ نے

---

جانبداری کی کوئی پروانہ کی۔ دوسری عالمی جنگ میں بھی جرمنی نے بیلجیم، ڈنمارک، ہالینڈ کی غیر جانبداری کو خس برابر بھی وقعت نہ دی۔ اتحادیوں کو ایران کے راستے روس سامان بھیجنا مناسب نظر آیا تو ایران کی غیر جانبداری ان کے لیے سدّ راہ نہ ہوئی۔

فرمایا کہ بے شک حق پر ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر ہم کیوں اس قدر دب رہے ہیں اور ذلت گوارا کر رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اللہ کا حکم ایسا ہی ہے۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سوال و جواب سے تسکین نہ ہوئی اور انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کی گفتگو کی۔ تاہم کچھ نتیجہ نہ نکلا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی تمام شرطیں منظور کر کے صلح نامہ مرتب کر دیا اور دستخط ہو گئے۔

## ابُو بَصیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کو روانہ ہوئے تو ساتھ ساتھ ابو بَصیر [1] بھی مسلمان ہو کر مکہ سے نکل آئے۔ قریش نے انکی جستجو میں دو آدمی بھیجے اور شرائط صلح یاد دلائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا۔ وہ ان کو لے کر چلے تو مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر کھجوریں نکالیں اور کھانے پینے میں مشغول ہوئے۔ ابو بَصیر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر بلطائف الحیل ان کے پھندے سے نکلنا چاہا۔ وہ کھجور کھانے میں مصروف تھے۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی تلوار کی طرف دیکھ کر کہا: کتنی اچھی تلوار ہے۔ اس نے داد پا کر تلوار کھینچ لی اور کہا بے شبہ، میں اس کا بارہا تجربہ کر چکا ہوں۔ ابو بَصیر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ بڑھا کر دیکھنے کے بہانے لے لی اور سب سے پہلے اسی شخص کی گردن قلم کر دی۔ دوسرا شخص یہ حالت دیکھ کر بھاگا اور دوڑتا ہُوا مدینہ پہنچا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشانی دیکھی تو فرمایا: اس پر کوئی مصیبت آگئی ہے۔ اس نے کہا: میرا ساتھی تو قتل کر دیا گیا ہے اور میں بھی قتل کے قریب پہنچ گیا تھا۔"

## ایک جمیعۃ کی فراہمی

اسی حالت میں ابو بَصِیر رضی اللہ عنہ بھی پہنچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عہد پورا کر کے مجھے واپس کر دیا۔ اب خدا نے مجھے نجات دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ دار نہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ شخص تو لڑائی کا شعلہ معلوم ہوتا ہے۔" ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ مجھے واپس کر دیں گے۔ چنانچہ وہ مدینہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے مقیم ہو گئے۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو وہ بھی ان سے جا ملے، یہاں تک کہ قریش کا جو شخص مسلمان ہوتا تھا وہ بھاگ کر ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے دامن میں پناہ لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے ایک اچھی خاصی جمیعۃ قائم کر لی اور قریش کے کاروان تجارت کو جو شام کی طرف جاتا تھا، عام طور پر لوٹنا شروع کر دیا۔ بالآخر

---

[1] ان کا نام عتبہ بن اَسِید تھا۔

قریش نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے ابو بصیر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بلا لیا۔ (بخاری)

## جنگ میں بھی عہد کی پابندی

عموماً زمانہ جنگ میں معاہدوں کی پابندی نہیں کی جاتی اور اشخاص کے باہمی معاہدے تو صلح کی حالت میں بھی کوئی جمہوری وقعت نہیں رکھتے، لیکن اسلام کی جمہوریت اور شخصیت دونوں ایک ہی روحانی طاقت کے تابع تھیں۔ اس لیے زمانہ جنگ میں اشخاص کے مجبورانہ معاہدوں کو بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا جاتا تھا۔ حذیفہ بن یمان کا بیان ہے کہ "میں غزوہ بدر میں صرف اس لیے نہیں شریک ہو سکا کہ میں اور ابو جندل رضی اللہ عنہ ساتھ چلے تو کفار قریش نے ہمیں گرفتار کر لیا اور کہا کہ تم محمد ﷺ کے پاس جاتے ہو۔ ہم دونوں نے کہا کہ نہیں، ہم صرف مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عدم شرکت جہاد کا معاہدہ لے کر ہمیں چھوڑ دیا۔ ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور شریک جہاد ہونا چاہا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ مدینہ کو واپس جاؤ، ہم کفار کے معاہدوں کو پُورا کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں صرف خدا سے مدد چاہتے ہیں۔ [1]

## فراخ دلی اور فیاضی

ایفائے عہد کے متعلق سب سے بڑی بحث یہ ہے کہ کس کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیے اور کس کے ساتھ قائم رکھنا چاہیے؟ یونان کے مقنن اعظم سولن نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا ہے اور وہی تمام دنیا کے سیاسیات کی روح ہے یعنی "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے، جو اپنے سے کمزور کو تو اُلجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے مقابلے میں ٹوٹ جاتا ہے۔" لیکن اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جس کے اخلاقی معاہدوں نے سولن کے اس تار عنکبوت کو توڑ دیا۔ اسلام ضعیفوں کے ساتھ فیاضانہ معاہدہ کرتا ہے اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے کفار قریش سے بہ مقام حدیبیہ جو صلح کی تھی، وہ بظاہر نہایت عاجزانہ و مجبورانہ صلح معلوم ہوتی ہے۔ خود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کا احساس کیا تھا اور آپ ﷺ نے بھی نہایت صراحت کے ساتھ فرما دیا تھا:

لا یسالون خطة یعظمون فیها حرمات اللہ الا اعطیتهم۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۸۹

”میرے سامنے وہ جو شرط پیش کریں گے میں اسے قبول کرلوں گا، بشرطیکہ اس سے شعائر الٰہی کی توہین نہ ہو۔[1]“

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گوہر مقصود یعنی ان مسلمانوں کو جو نورِ ایمان سے لبریز ہو کر آتے تھے، واپس کرنے کا عہد کرلیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ پر ”بسم اللہ“ لکھنا چاہا۔ کفار نے اس سے انکار کیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اصرار کے کفار کی خواہش پوری کردی اور ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ کی جگہ ”باسمك اللهم“ لکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نام کے ساتھ ”رسول اللہ“ لکھنا چاہا۔ کفار نے کہا: اگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا؟ صرف محمد بن عبداللہ لکھیے۔ ”معاہدہ پر رسول اللہ کا لفظ لکھا جاچکا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ”اسے مٹادو“ ان کے جوش ایمان نے اسے گوارا نہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مٹادیا۔

اس سے زیادہ کمزوری اور کیا ہوسکتی ہے؟ لیکن کیا درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجبور تھے؟ کیا قریش کی عظیم الشان طاقت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل بے دست و پا کردیا تھا؟

## صلح و امن

تمام سلطنتیں نقض عہد کے لیے ضعف کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں اور صلح تو ہمیشہ قوی ہی کے ساتھ کی جاتی ہے، لیکن اسلام کی امن پسندی نے ایک نہایت ضعیف گروہ کے مقابلے میں یہ فیاضانہ صلح کی اور اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا:

انا لم تجئی لقتال احد و لکنّا جئنا معتمرین و ان قریشاً قد تھلکھم الحرب و اخرت بھم فان شاوٗ اشاو رتھم مدۃ۔

”ہم کسی سے لڑنے بھڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں۔ قریش کو متواتر لڑائیوں نے چور چور کردیا ہے اور ان کی طاقت کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ بہ ایں ہمہ وہ چاہیں تو ہم ایک مدت کے لیے ان سے صلح کرسکتے ہیں۔“

دنیوی سلطنتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اس بہترین موقع سے کیا کام لیتیں؟ انعقاد صلح کا یا اشتعال جنگ کا؟ دنیا کی قدیم و جدید تاریخ اس کا نہایت آسانی کے ساتھ جواب دے سکتی ہے۔ اگر اس حالت میں کوئی سلطنت صلح بھی کرتی تو اس کا نتیجہ جنگ سے زیادہ درد انگریز ہوتا۔

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ قریش لڑائیوں کے ذمہ دار تھے جو اسلام کو بہ جبر و قوت مٹانے کے درپے تھے۔ صلح حدیبیہ میں وہ جنگ سے دست بردار ہو رہے تھے۔ یہ اسلام کے لیے فتح مبین تھی۔ لہٰذا اس بنیادی اور اساسی فتح کے سلسلے میں ہر شرط قبول کی جاسکتی تھی۔ البتہ شعائر الٰہی کی حرمت کا لحاظ لازم تھا۔

## اہل نجران سے معاہدہ

لیکن یہ جزئی طرز عمل صرف اختلافی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلام کی وسعت ایک مستقل اور جامع ہدایت کی محتاج تھی، جو اس اخلاقی طرز عمل کے ساتھ اپنے اندر ایک قانونی طاقت بھی رکھتی تھی اور جب پچھلوں کی اخلاقی طاقت آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو بھلا دیتی تو وہ اپنی جزئی طاقت سے اس کو یاد دلاتی۔ آنحضرت ﷺ نے غیر قوموں کے ساتھ جو تحریری معاہدے کیے ہیں وہ بالکل قانونی اور سیاسی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس باب میں اسلام کا قانون کس قدر فیاضانہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

علی اهل نجران الفی حلة النصف فی صفر والنصف فی رجب یردونها الی المسلمین وعاریة ثلاثین درعا و ثلاثین بعیرا و ثلثین من کل صنف من اصناف السلاح یغزون بها و المسلمون ضامنون لها حتی یردوها علیهم ان کان بالیمن کید ذات غدر علی ان لا تهدم لهم بیعه ولا یخرج لهم قس ولا یفتنوعن دینهم۔ (ابوداؤد جلد: ۲ ص:۷۵)

"اہل نجران کو دو ہزار حلے باقساط دینا پڑیں گے۔ ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہِ رجب میں اور ان کو تیس زرہیں، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور ہر قسم کے ہتھیار بطور عاریت کے بھی دینے ہوں گے۔ اگر یمن میں کوئی جنگ ہو گی تو وہ لوگ ان چیزوں کو واپس کر دیں گے اور اس معاہدہ کی بنا پر نہ تو ان کے گرجے گرائے جائیں گے، نہ ان کے کسی پادری کو جلاوطن کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہب سے کوئی تعرض ہو گا۔"

## اخلاقی نصائح

لیکن اسلام کا ہر قانون اپنے اندر اخلاقی رُوح بھی رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اخلاقی نصائح سے اس کو اور بھی موثر بنا دیا:

الا من ظلم معاهدا او انتقصه او کلفه فوق طاقة او اخذ منه شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجته یوم القیامة۔ (ابوداؤد جلد:۲ ص: ۷۷)

"خبردار، اگر کسی نے کسی غیر مذہب رعیت پر ظلم کیا، یا اس کی تنقیص کی یا اس کی کوئی چیز بہ جبر لے لی۔ اگر ایسا ہوا تو میں اس کی طرف سے قیامت کے دن خدا کے سامنے جھگڑوں گا۔"

## ایک قبطی کا واقعہ

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضرت ﷺ کے بعد اس فیاضانہ طرز عمل کو نہایت بے تعصبی کے ساتھ قائم رکھا چنانچہ ہشام ابن حکیم نے حمص کے عامل کو دیکھا کہ قبطیوں کو دھوپ میں بٹھا کر جزیہ وصول کر رہا

ہے۔ انہوں نے اسی وقت آنحضرت ﷺ کی یہ اخلاقی نصیحت یاد دلائی۔

ان اللہ یعذب الذین یعذبون الناس فی الدّنیا۔

”خدا قیامت میں ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں انسانوں کو دُکھ پہنچاتے ہیں۔“

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیّت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اسی اخلاقی قانون کی تجدید کی تھی:

واوصیت بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ﷺ ان یوفی لھم لعھدھم وان یقاتل من ورائھم ولا یکلّفوا الا طاقتھم۔ (بخاری جزو: ۴ ص: ۶۹)

”میرے بعد جو خلیفہ ہوگا میں اس کو خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے معاہدے کی حفاظت کے لیے وصیت کرتا ہوں، وہ وصیت یہ ہے کہ غیر مذہب رعایا سے جو معاہدہ کیا جائے وہ پورا کیا جائے۔ ان کی جان ومال کی حفاظت کے لیے لڑائی کی جائے اور ان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا جائے جس کے وہ متحمل ہوں۔“

## فاتح اور پیغمبر کا فرق

جہاد اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے، اس کے لحاظ سے وہ دنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف اس قدر بدیہی ہے کہ ہم کو اس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خط وخال کے اندر نمایاں طور پر نظر آسکتا ہے۔

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادہ سے میدان جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل و دہل کے غلغلے اور قرناء دبوق کے ترانے خیر مقدم بجالاتے ہیں، سر پر پرچم لہراتا ہے۔ چتر شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اس کی طرف نگاہِ گرم سے دیکھنے نہیں دیتا۔ جاہ وجلال کا یہ دیوتا میدان جنگ میں ایک مجسمہ کی طرح کھڑا کر دیا جاتا ہے اور تمام فوج اسی مرصّع بت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے۔ عظمت وجبروت کا یہ منظر دنیا کو دفعتہ مرعوب کر دیتا ہے اور اس رعب وداب کے احساس سے اس دنیوی فتح کا سر بادۂ کبر ونخوت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خاک وخون میں مل کر بھی یہ نشہ نہیں اترتا۔ اگر کوئی اس سر پر غرور کو ٹھکرا دیتا ہے تو اس سے مغرورانہ صدا بلند ہوتی ہے۔

## پیغمبر کا سفر

لیکن ایک پیغمبر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو اگرچہ مخلصین و مومنین کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہوتی ہے لیکن وہ اپنا رفیق سفر صرف خدا کو بناتا ہے:

كان رسول الله ﷺ اذا سافر قال اللهم انت الصاحب في السفر و الخليفة في الاهل! اللهم إني اعوذبك من وعثاء السفر وكابة المنقلب و سؤ المنظر في الاهل والمال اللهم اطولنا الارض وهون علينا الضر!

"آنحضرت ﷺ جب بغرض جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا کرتے تھے، خدایا! تو ہی ہمارا رفیق سفر ہے، تو ہی ہمارے بال بچوں میں ہمارا قائم مقام ہے۔ خدایا! سفر کے شدائد اور پلٹ کر اہل و عیال کو بُرے حال میں دیکھنے کی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔ خدایا مسافت سفر کو کم کر دے اور ہمارے لیے آسان بنادے۔"

## سواری

وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقۡرِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾ (الزخرف:۱۳)

"کیا پاک و برتر ہے وُہ خدا جس نے اس سواری کو ہمارا فرمانبردار بنادیا ورنہ ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے تھے"

## سفر سے واپسی

وُہ سفر سے پلٹتا ہے تو راہ میں خدا کی حمد کا ترانہ گاتا ہوا چلتا ہے:

آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون! [1]

"ہم لوٹ کر آنے والے ہیں۔ ہم توبہ کرنے والے ہیں ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں اور ہم اپنے رب کی حمد ثنا کرتے ہیں۔"

پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے تو غلغلۂ تکبیر بلند کرتا ہے، نیچے اترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح و تہلیل ہوتا ہے۔

---

[1] یہ بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ یا حج یا عمرہ سے لوٹتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر فرماتے :

لاالٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریك لهٗ لهُ الملك ولهُ الحمد و هو علیٰ كل شيءٍ قدیر، آئبون، تائبون، عابدون، ساجدون، لربنا حامدون صدق الله وعدهٗ و نصر عبدهٗ وهزم الاحزاب وحدهٗ۔

"خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی اس کا شریک نہیں۔ ملک اسی کا ہے، ستایش اسی کے لیے ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے ہم لوٹ کر آنیوالے ہیں، تائب ہیں، عبادت گزار ہیں۔ اپنے پروردگار کی حمد کرتے ہیں اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے ہی تمام احزاب یعنی گروہوں اور لشکروں کو شکست دی۔ (کتاب المغازی، باب غزوہ احزاب)

## فوج کی روانگی

فوج کو روانہ کرتا ہے تو اسے نہ غرور و طاقت کی یاد دلاتا ہے، نہ اس کے جوش کو دوآتشہ کرتا ہے، نہ قدیم کارنامہ ہائے شجاعت کا تذکرہ کر کے اس کے دل کو گرماتا ہے، بلکہ اس کے دین کو، اس کی امانت کو، اس کے تمام نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کر کے رخصت کر دیتا ہے:

استودع اللہ دینکم و امانتکم و خواتیم اعمالکم۔

"میں تمہارے دین، تمہاری امانت اور تمہارے نتائج اعمال کو خدا کے سپرد کر کے تمہیں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے بھیجتا ہوں۔"

## منزل پر نزول

وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ سلاطین کی طرح اس کے لیے خیمے قائم کیے جاتے ہیں، نہ فرش و بساط شاہانہ سے زمین آراستہ ہوتی ہے اور نہ میدان کا نشیب و فراز ہموار کیا جاتا ہے۔ وہ خدا کا نام لے کر فرش خاک پر لیٹ جاتا ہے اور اس نام کی عظمت کے سہارے پر زمین ہی کو اپنی حفاظت کی خدمت سُپرد کر دیتا ہے:

یا ارض ربّی و ربك اللہ اعوذ باللہ من شرك و شرِ ما فیك و من شرّ ما یدبّ علیك۔

"اے زمین! میرا اور تیرا، دونوں کا خدا ایک ہی ہے۔ میں تیرے شر سے، تیری سطح باطنی کے شر سے اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے، پناہ مانگتا ہوں۔"

## جہاد سے مراجعت

وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اسے خدا کا گھر یاد آتا ہے اور مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا کرتا ہے، جب اسے فتح و ظفر کی خبر ملتی ہے تو نہ تو اس کے سامنے شادیانے بجائے جاتے ہیں، نہ جشن شاہانہ کی تیاریاں کی جاتی ہیں، نہ عیش و طرب کے گانے گائے جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے خدا کے آگے سر بہ سجود ہو جاتا ہے اور سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ اسے جب مشیت ایزدی سے شکست ہوتی ہے تو وہ فوج کو بالکل جوش و غیرت نہیں دلاتا، بلکہ خدا ہی کی غیرت کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے کیونکہ وُہ اپنی فوج کو خدا کی فوج یقین کرتا ہے:

کان یقول یوم احد: اللّٰھمّ انّك ان تشاء لا تعبد فی الارض۔

"آپ ﷺ معرکہ احد کے دن کہتے تھے: خدایا کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو؟"

## میدانِ جنگ میں خدا سے التجا

وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت دیکھتا ہے تو صرف رحمت آسمانی ہی سے مدد طلب کرتا ہے اور کسی دنیوی طاقت کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلاتا:

لما کان یوم بدر نظر رسول اللہ ﷺ الی المشرکین وھم الف و اصحابه ثلاثمأة وتسعة عشر رجلا، فاستقبل القبلة ثمّ مدّیدیه فجعل یھتف بربه، اللھم انجزلی ماوعدتنی، اللھم اٰت ماوعدتنی اللّٰھمّ ان تھلك ھٰذہ العصابة من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض۔ فما زال یھتف بربّه مادأیدیه مستقبل القبلة حتی سقط رداءہ عن منکبیه فاتاہ ابوبکر فاخذ رداءہ فالقاہ علی منکبیه، ثم التزمه من ورائه وقال یانبی اللہ! کفاك مناشدتك ربّك فانهٗ سینجزلك ماوعدك۔ (مسلم)

"بدر کے دن جب آنحضرت ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا اور آپ ﷺ کو نظر آیا کہ ان کی جمعیت ایک ہزار کی ہے اور مسلمان صرف تین سو انیس ہیں تو آپ ﷺ قبلہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا کو پکارنا شروع کیا: خدایا تو نے مجھ سے فتح و ظفر کا جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر! خدایا اگر مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ وہ اسی طرح ہاتھ پھیلا کر متصل پکارتے رہے، یہاں تک کہ جوشِ استغراق میں دوش مبارک سے چادر گر گئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے اس تضرع والحاح کو دیکھا تو پاس آئے اور چادر اٹھا کر آپ ﷺ کے کاندھے پر ڈال دی۔ پھر پیچھے سے آکر آپ ﷺ سے لپٹ گئے اور کہا: "یارسول اللہ! آپ ﷺ اپنی مناجات ختم کیجیے، خدا نے آپ ﷺ سے جو وعدہ کیا ہے اسے بہت جلد پورا کرے گا"۔

## میدان جنگ میں زخم

میدان جنگ میں اسے شدید زخم لگتا ہے، تو اس حالت میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے:

رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔ (مسلم)

"خدایا! میری قوم کو معاف فرما، کیونکہ وہ لوگ حق کو نہیں جانتے۔"

لیکن جب کبھی اس کے ہاتھ سے جہاد کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے تو وہ از فرق تا بقدم غضب و قہر الٰہی کا پیکر جلال و جبروت بن جاتا ہے:

ملاء اللہ قبورھم نارا قد شغلونا عن الصلوٰۃ الوسطی۔

"خدا کفار کی قبروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ انھوں نے ہماری نماز عصر قضا کرا دی۔"

## بادشاہ اور پیغمبر کا فرق

قصہ مختصر، ایک فاتح میدان جنگ میں "سر پر غرور" مگر ایک پیغمبر "جبین نیاز" ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں "زبان خود ستا"، مگر ایک داعی حق "زبان شکر سنج" ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ میدان جنگ میں "غیظ و غضب" کا آتش کدہ مگر ایک مناد توحید "رحم و کرم کا سرچشمہ" ہوتا ہے۔ ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہے۔ بادشاہوں کے سر پر غرور بارہا ٹھکرا دیے گئے، لیکن کسی موید من اللہ کی جبین نیاز خاک مذلت سے آلودہ نہ ہوئی۔ بادشاہوں کی زبان خود ستا بارہا ذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی، لیکن کسی داعی الٰہی کا نغمہ حمد و شکر کبھی چپ نہ ہوا۔ بادشاہوں کے غیظ و غضب کے شعلے بارہا بجھا دیے گئے ہیں مگر کسی پیغمبر کے دریائے کرم کو دنیا کے خس و خاشاک نہ روک سکے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ [1]

(الصّٰفّٰت:۱۷۱۔۱۷۳)

## مساوات

مساوات قانونی کو چھوڑ کر عام طرز مساوات پر غور کرنا چاہیے۔ آنحضرت ﷺ تمام مسلمانوں کے آقا و سردار تھے، تاہم آپ ﷺ نے عام مسلمانوں سے اپنے لیے کبھی کوئی امتیاز نہ چاہا۔ ایک سفر میں کھانا پکانے کے لیے صحابہ نے کام تقسیم کر لیے تو جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت سرور کائنات ﷺ نے خود اپنے ذمے لے لی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ دس برس خدمت نبوی میں رہے لیکن ان کا بیان ہے کہ اس مدت میں جتنی خدمت آپ ﷺ کی میں نے کی' اس سے زیادہ آپ ﷺ نے میری کی۔ مساوات کا یہ عالم تھا کہ "ماقال لی فی شئ لما فعلت" یعنی تحکمانہ کام لینا یا جھڑ کی دینا تو بڑی بات ہے، کبھی آپ ﷺ نے اتنا بھی نہ فرمایا کہ فلاں کام یوں سے یوں کیوں کیا؟

## غلام اور آقا

ایک صحابی نے اپنے غلام کو مارا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے بھائی ہیں، جنہیں خدا نے تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جو خود کھاؤ، وہ انھیں کھلاؤ، جو خود پہنو، وہ انھیں پہناؤ۔

---

[1] اور ہمارا حکم ہمارے بندوں کے حق میں پہلے سے ہو چکا ہے جو رسول ہیں کہ بیشک انھی کو مدد دی جائے گی۔ بے شک ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

اسلام نے نہایت شدت کے ساتھ اس سے روکا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو، خواہ وہ کیسا ہی ادنیٰ درجے کا کیوں نہ سمجھا جاتا ہو، "غلام" اور "باندی" کہے۔ کیونکہ سب خدا ہی کے غلام ہیں۔ اسی لیے غلاموں کو فرمایا: "اپنے مربیوں کو" آقا" نہ کہیں کیونکہ اس سے مساوات اسلامی میں فرق آتا ہے۔"

ایک بار ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں خطاب کیا: "اے آقائے من" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے آقا نہ کہہ، آقا تو ایک ہی ہے یعنی خدا۔

## ایک یگانہ مثال

قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری میں ماخوذ ہوئی۔ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرنے کے لیے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو آمادہ کیا، جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن جب اس واقعے کے متعلق اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کرکے فرمایا:

انما اهلك الذين قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه و اذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحدود، ايم الله لوان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها۔ (بخاری، الشفاعته الحدود)

"لوگو! تم سے پہلی قومیں اس لیے ہلاک کی گئیں کہ جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے پر جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اسے سزا دیتے لیکن خدا کی قسم! اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو اس کے ہاتھ ضرور کاٹے جاتے۔"

چوری کا ذکر صرف خصوصیت واقعہ کی بنا پر ہے ورنہ اس سے مراد عام جرائم ہیں۔

# پیغمبر اسلام کی دعوت

## عالمگیر دعوت

پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کسی خاص قوم اور ملک کے لیے نہیں تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷[1] جوامع آیات میں سے ہے، جس نے دعوت اسلام کی پوری حقیقت واضح کر دی:

۱۔ یہ دعوت یکساں طور پر تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔

۲۔ یہ ایک خدا کے آگے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۳۔ ایمان باللہ و کلمات اس کا شعار ہے، یعنی خدا پر اور اس کے تمام کلمات وحی پر ایمان۔

فرمایا: خدا نے مجھے تم سب کی طرف بھیجا ہے وہ خدا کہ آسمان و زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے یعنی جب تمام کائنات ہستی میں ایک ہی خدا کی فرمانروائی ہے تو ضروری ہوا کہ اس کا پیغام ہدایت بھی ایک ہی ہو اور سب کے لیے ہو۔

## پیام زندگی

پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت اس لیے ہے کہ تمہیں زندہ کر دے[2] یعنی وہ انسانیت اعلیٰ کے

---

[1] سورۃ اعراف کی آیت ۱۵۷ ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

(اے پیغمبر) کہو اے افراد نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کے بادشاہت اسی کے لیے ہے، کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں پر) ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔

[2] اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت: ۲۳ کی طرف یعنی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ

انبعاث و قیام کی دعوت ہے۔ غور کرو اس دعوت نے وقت کی تمام مردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر مردوں کو جلانا کیا ہوگا۔ عرب کے سار بانوں میں ابوبکر، عمر، علی، عائشہ، خالد، ابن ابی وقاص، ابن العاص (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر پیدا ہو گئے اور پچاس برس کے اندر عرب کے وحشی، کرۂ ارضی کی سب سے بڑی اور مہذب قوم تھے۔

## توحید

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ مالک الملک ہے، حی و قیوم ہے۔ اس کی حکومت سے کوئی گوشہ باہر نہیں اس کے علم سے کوئی شے مخفی اور اوجھل نہیں۔ وہ غفلت سے منزہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ہستی کی ایسی صفتیں ہوں، اس کے سامنے کسی کی سعی و سفارش کی کیا گنجائش ہے اور اس کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جرأت کر سکتا ہو؟

## بعض ضروری نکتے

قرآن مجید میں توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات بھی کمال پر پہنچا دی گئی۔ انسان کے لیے دینی عقاید و اعمال کا جو تصور قائم کیا، اس کی بنیاد تمام تر رحمت و محبت پر رکھی۔

سورۂ فاتحہ میں ربوبیت و رحمت کی صفتوں کے بعد "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳" (جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا) کہہ کر صفت عدالت کا ذکر کیا اور تمام صفات جلال کو عدالت ہی کے تابع رکھا۔

۱۔ فطرت کائنات میں ربوبیت و رحمت کے ساتھ مجازات بھی ہیں۔ انسان نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا۔ اس طرح خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصور پیدا ہو گیا، حالانکہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کیا گیا، وہ عین مقتضائے رحمت ہیں، تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی تو میزان عدل قایم نہ رہتی اور نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

۲۔ صفات الٰہی میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں، البتہ عدالت ضرور ہے اور صفات قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں دراصل اسی (عدالت ہی) کے مظاہر ہیں۔

(توحید فی الصفات میں صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی تمام راہیں بھی بند کر دیں)۔

(الف) عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی

---

کر دے۔

دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔

(ب) صرف خدا ہی کی ذات انسانوں کی پکار سنتی اور دعائیں قبول کرتی ہے۔ اگر تم نے دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔

(ج) اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کر لیا تو توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

(د) یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿٤﴾" میں اول عبادت کے ساتھ استعانت کا ذکر بھی کیا گیا۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا، جو مفید حصر ہے یعنی "صرف تیری ہی عبات کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔"

(ہ) سب سے زیادہ اہم مسئلہ شخص نبوت کی حد بندی کا تھا۔ پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا اور اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ یہ قرار دیا، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ "یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (ﷺ) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں"۔ اس میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے (اور بندگی کا اقرار رسالت کے اقرار پر مقدم ہے)۔

## نبوت کی روشن ترین دلیل

سورۂ یونس میں ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾

(آیت: ۱۶)

"تم کہو، اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟"

صداقت نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں، جس کے فضائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تمہیں میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس سال کی مدت تک یہ عمر انسان کی پختگی کی خاص مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری

زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصے میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پاسکتے؟

تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق و فضائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے، جو سانچا اس عرصے میں بن گیا، وہ بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا پھر فرمایا:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾ (یونس: ۱۷)

"بتلاؤ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے، جو اپنے جی سے جھوٹ بنا کر اللہ پر افترا کرے اور اس آدمی سے جو اللہ کی سچی آیتیں جھٹلائے؟ یقیناً جرم کرنے والے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے"۔

دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں، جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر ہے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا۔ اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا، اس کا کلمۂ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔

## پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت

پیغمبر اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے تھے، جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی، چونکہ اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہ تھے اس لیے مجبور ہو جاتے تھے اسے جادو سے تعبیر کریں
۔

"الانبیا" کی آیت [1] میں فرمایا: وہ پیغمبر اسلام کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

---

[1] سورۃ انبیاء کی آیت ۳ یہ ہے:
لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۳﴾ "دل ہیں کہ یک قلم غافل اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے سرگوشیاں کیں۔ یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جادو کے سوا اور کچھ نہیں؟"

تم ان کے پاس گئے اور جادو میں پھنسے، یہ ہماری طرح ایک آدمی ہے، پس جو کچھ اس کا اثر و نفوذ ہے، وہ جادو ہی کی وجہ سے ہے۔

سچائی کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اسے سچائی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر اور کچھ کہنا چاہو گے تو کتنا ہی زور لگاؤ، بات بنے گی نہیں، بنے گی اسی وقت جب سر جھکا دو گے کہ ہاں یہ سچائی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نفس انسانی کی گمراہی و سرکشی پر حقیقت کا اعتراف ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ وہ بغیر لڑے کبھی ہتھیار نہیں رکھے گی۔ وہ مانے گی (کیونکہ سچائی منوائے بغیر رہ نہیں سکتی) مگر اس وقت جب ماننے پر مجبور ہو جائے۔

پیغمبر اسلام نے جب کلام حق کی منادی شروع کی تو قریش مکہ کا یہ حال ہوا۔ وہ سچائی دیکھ رہے تھے، مگر اسے سچائی سمجھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ مجنون ہو گیا ہے، خواب و خیال کو وحی و نبوت سمجھتا ہے۔ پھر تاثیر نفوذ دیکھتے تو کہتے جادوگر ہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور یہ ساری باتیں آپس میں کہیں۔ (ابن ہشام)

## دین میں جبر نہیں

اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین و اعتقاد کے معاملے میں کسی طرح کا جبر و استکراہ جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ جبر و استکراہ سے۔

قریش مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ کہ ظلم و تشدد سے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا، پس جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا خود اسی بات کا منکر کیونکر ہو سکتا ہے۔

دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی راہ ہے، جدل و خصومت کی راہ نہیں۔ داعی حق کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسا دے یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر اس کا ناطقہ بند کر دے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے دل میں سچائی اتار دے۔

## خدا پرستی اور نیک عملی

خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، خدا کے تمام رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنا سچا اور کامل ایمان ہے۔ خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور آخرت دین کے بنیادی حقائق ہیں۔

"خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اولاد کو مفلسی کے ڈر

سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں روزی دیتے ہیں، انہیں بھی دیں گے۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ کسی جان کو قتل نہ کرو جسے خدا نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ یتیموں کے مال کی طرف نہ بڑھو۔ جب کبھی کوئی بات کہو، انصاف کی کہو، اگرچہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے، اسے پورا کرو۔

خدا پرستی اور نیک عملی کی یہی راہ میری (خدا کی) ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے، اسی پر چلو، اور راہوں پر نہ چلو کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمہیں تتر بتر کر دیں۔ جو کوئی اللہ کے حضور نیکی لائے گا تو اس کے لیے اس عمل نیک سے دس گنا زیادہ ثواب ہو گا اور جو کوئی برائی لائے گا تو اس کے بدلے ہی سزا پائے گا۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، وہی درست اور صحیح دین ہے۔ ابراہیمؑ کا طریقہ کہ ایک خدا کے لیے ہو جانا۔ میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا صرف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار (یعنی مسلم) ہوں۔" (القرآن)

## اوامر و نواہی

۱۔ توحید فی العبادت کی تلقین، کیونکہ نفس توحید کا اعتقاد تو تمام پیروان مذاہب میں موجود تھا، لیکن توحید فی العبادت کی حقیقت مفقود ہو گئی تھی۔

۲۔ پھر والدین کے حقوق پر توجہ دلائی گئی۔ انسان کے لیے والدین کی ربوبیت، ربوبیت الٰہی کا پرتو ہے۔ والدین کی خدمت و اطاعت کی آزمائش کا اصلی وقت ان کے بڑھاپے میں آتا ہے، جب کمزوریاں انہیں دوسروں کی خدمت کا محتاج بنا دیتی ہیں۔
انسان کی احتیاج کے دو ہی وقت ہیں: طفولیت اور بڑھاپا۔ طفولیت میں ماں باپ نے خدمت کی تھی، بڑھاپے میں اولاد کو خدمت کرنی چاہیے۔

۳۔ ماں باپ کے بعد ان سب قرابت داروں کے حقوق ہیں، جو ہماری خبر گیریوں کے محتاج ہوں، ساتھ ہی "تبذیر" یعنی بے محل خرچ کرنے سے روکا۔ فرمایا: مال و دولت بے محل خرچ نہ کرو، خرچ کرنے کا صحیح محل ارباب حقوق ہیں۔

۴۔ مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو، کسی ایک طرف نہ جھک پڑو کہ خرچ کرنے پر آئے تو سب کچھ اڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو کنجوسی پر اتر آئے۔

۵۔ اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہلاک نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

۶۔ زنا سے دور رہو، یہ بڑی بے حیائی کی بات اور بڑی برائی کا چلن ہے۔

۷۔ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو۔ جسے قتل نہ کرنا اللہ نے حرام ٹھہرادیا ہے، ہم نے مقتول کے وارث ( یاوارثوں) کو مطالبہ قصاص کا اختیار دے دیا ہے۔ پس چاہیے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کی جائے۔

۸۔ یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ (یعنی اسے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو) مگر ایسے طریقے پر جو ان کے لیے بہتر ہو، جب یتیم جوان ہو جائیں تو امانت ان کے حوالے کردو۔

۹۔ عہد پورا کرو، اس کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائے گی۔

۱۰۔ جب کوئی چیز ماپو تو پیمانہ بھرپور رکھا کرو۔ تولو تو صحیح ترازو سے (یعنی نہ ماپ میں کمی کرو اور نہ تول میں ڈنڈی مارو)۔

## فرمانبرداروں کے نشان

ان لوگوں کے اعمال و اوصاف (کی مجمل سی کیفیت) جنھوں نے احکام حق قبول کیے اور دنیا کے لیے نافع بن گئے۔

الف۔ اللہ کی بندگی کا عہد پورا کرتے ہیں اور اپنی عبودیت میں سچے اور کامل ہیں۔

ب۔ اللہ نے جو رشتے جوڑ دیے، انہیں ظلم و ناانصافی سے توڑتے نہیں بلکہ رشتے کا پاس کرتے اور ہر علاقے کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس عمل میں تمام حقوق العباد آگئے جس طرح الف میں حقوق اللہ آگئے۔

ج۔ آخرت کی فکر سے بے پروا نہیں ہوتے۔ جو کچھ کرتے ہیں، اس میں خوف آخرت کی کھٹک موجود ہوتی ہے۔ یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز کسی کے آگے پیش ہونا ہے اور حساب کی سختی سے بچنا ممکن نہیں۔

د۔ اللہ کی محبت میں ہر طرح کی ناخوشگوار حالتیں صبر و ثبات کے ساتھ جھیل لیتے ہیں، شدتوں اور محنتوں سے منہ نہیں موڑتے، آزمائشوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے۔

ہ۔ نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قائم کرتے ہیں۔

و۔ جو کچھ کماتے ہیں، اسے صرف اپنے ہی نفس پر خرچ نہیں کرتے، دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں اور ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، کھلے طور پر بھی اور پوشیدہ طور پر بھی۔

ز۔ بدی کے بدلے بدی کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ کوئی ان کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے، وہ بھلائی ہی سے پیش آئیں گے۔

## ایمان والوں کے پانچ وصف

مومنوں کے پانچ وصف خصوصیت سے بیان کیے گئے۔ گویا قرآن کے نزدیک ایمان و عمل کے مرقع میں سب سے زیادہ نمایاں خط و خال یہی ہیں۔ جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں وہ مومن کی زندگی نہیں ہو سکتی۔

الف۔ نماز کی محافظت اور اس کا خضوع و خشوع سے ادا کرنا۔ کسی باہیبت وجلال مقام پر کھڑے ہو جاؤ، تمہارے ذہن و جسم پر کیسی حالت طاری ہو جائے گی؟ ایسی ہی حالت کو عربی میں "خشوع" کہتے ہیں۔

ب۔ ہر اس بات سے مجتنب رہنا جو نکمی ہو، صرف انہی باتوں کا اشتغال رکھنا جو دین و دنیا میں نافع ہوں۔

ج۔ کمائی میں سے اپنے محتاج بھائیوں کے لیے خرچ کرنا۔

د۔ زنا سے کبھی آلودہ نہ ہونا۔

ہ۔ امانت دار ہونا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنا۔

## راہ حق کے پیشرو

راہ حق میں سب سے آگے نکل جانے والے وہ ہیں:

الف۔ جو اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ب۔ جو پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

ج۔ جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا تامل دے دیتے ہیں۔ ان کے دل ترسان رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور انہیں لوٹنا ہے۔

## طریق خیر و سعادت

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ قرابت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قرابت دار ہو، خواہ اجنبی، ہر حال میں اچھے برتاؤ کا مستحق ہے۔ اسی طرح جو لوگ تمہارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہوں لونڈی غلام جو تمہارے قبضے میں ہیں، ان سب کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت اور احسان سے پیش آؤ۔

بخل نہ کرو، خدا نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں خرچ کرو۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہاتھ انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے کبھی رک نہیں سکتا۔ البتہ جو کچھ خرچ کرو اللہ کے لیے کرو، نام و نمود کے لیے نہ کرو۔

## نظم و فلاح میں اصل اصول

اجتماعی زندگی میں نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حقدار ہو، اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے، وہ اس کے حوالے کر دو۔ وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو، قرضدار کا قرض ہو، امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو۔ جو جس کا اہل ہو، اسے ملنا چاہیے۔

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو صرف عدل و انصاف پیش نظر ہو، کسی حالت اور کسی صورت میں بھی یہ جائز نہیں کہ فیصلہ انصاف کے خلاف کیا جائے۔

## مسلمانوں کے لیے اصل دین

مسلمانوں کے لیے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں (بشرطیکہ اصحاب حکم و اختیار کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش نہ ہو جو اللہ اور رسول کی اطاعت کے خلاف ہو) بہ صورت نزاع اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی طرف رجوع کیا جائے اور جو فیصلہ ملے، اس کے آگے سب سر تسلیم خم کر دیں۔

## قوامون بالقسط

مسلمانوں کو چاہیے کہ "قوامون بالقسط" ہوں یعنی حق و راستی پر اس مضبوطی سے قائم رہنے (اور جم جانے والے) کہ کوئی بات بھی انہیں جگہ سے ہلا نہ سکے۔ چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں۔ دنیا کی کوئی چیز انہیں سچ کہنے سے روک نہ سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور اعزہ و اقربا کے خلاف ہو، جب بھی انہیں سچی ہی بات کہنی چاہیے، وہ صرف سچائی ہی کے لیے دل و زباں رکھتے ہیں۔ [1]

## بنیادی دستور العمل

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے شعائر کی بے حرمتی روا نہ رکھیں۔ دوسروں کے معاملے میں ان کا دستور العمل یہ ہونا چاہیے کہ نیکی کے کاموں میں سب کی مدد کریں۔ کوئی ظلم کرے تو یہ برائی

---

[1] سورۂ مائدہ ۸ میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ:
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ "ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اس بات کے لیے ابھار دے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے"۔

ہے، اس سے بچیں۔ کوئی حج وزیارت کو جائے تو یہ بھلائی ہے اس کے معاون بنیں (گویا نیکی اور پرہیز گاری کی ہر بات میں تعاون، گناہ اور ظلم کی ہر بات میں لاتعاون ہر مسلمان کے لیے بنیادی اصل کا رہے)۔

دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام چاہتا ہے کہ ہم اپنی سیرت میں سر تا سر حق و صداقت کے پیکر بن جائیں۔

## انسانی مساوات

نسل انسانی کی مساوات کا اعلان اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار جو لوگوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، وضیع ہو یا شریف، انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں قریش کو خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار فرمادی تھی۔ فرمایا:

"اے جماعت قریش! خدا نے تمہاری جاہلانہ نخوت اور آباواجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا (سچ تو یہ ہے) سب لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے: "لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ گو کہ قبیلے سب پہچان کے لیے بنادیے ہیں اور خدا کے ہاں تو اس کی زیادہ عزت، جس میں تقویٰ زیادہ ہے"[1]

جب تمام انسان ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا) کی اولاد ہیں تو انسان ہونے میں امتیازات کی کون سی وجہ ہے۔ پھر خدا کے ہاں عزت کا جو معیار قرار پایا یعنی تقویٰ، وہ ایسا ہے کہ اس میں انسانوں کے درمیان حسد ورقابت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ منافی تقویٰ ہو گی۔ باقی ہر معیار یعنی دولت، عہدہ، رنگ وغیرہ میں حسد ورقابت کے سوا اور کسی بات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔"

## دین کی اصل عظیم

دین کی اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اصل شے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے۔ شریعت کے ظاہری احکام ورسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔

نزول قرآن کے وقت دنیا کی ایک عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے، دین سے مقصود

---

[1] متین جلد اول ص ۱۵۶۔ جس آیت کا ترجمہ دیا گیا ہے وہ سورۃ حُجرات کی تیرھویں آیت ہے یعنی: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ

محض شریعت کے ظواہر ورسوم ہیں اور انہیں کے کرنے، نہ کرنے پر نجات وسعادت موقوف ہے۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے، ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے، نہ کہ وسائل کی۔

## ابراہیم علیہ السلام کی راہ

دین کی جو راہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کی تھی، وہ کیا تھی؟ ان کے بعد ان کی اولاد جس طریقے پر چلتی رہی، وہ کون سا طریقہ تھا؟ خود حضرت یعقوب علیہ السلام نے بستر مرگ پر جس دین کی وصیت کی تھی وہ کونسا دین تھا؟ وہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی نہ تھی (اس وقت تک یہودیت اور مسیحیت کا تو وجود بھی نہ تھا) وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اس کے قانون سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی۔ اسی کی دعوت قرآن نے دی۔

دین الٰہی کو "الاسلام" کے نام سے تعبیر کیا گیا، جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعت حق کی طرف انسانوں کو دعوت دی جائے۔[1]

## عمل کی کمائی

قانون الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد کو وہی پیش آتا ہے۔ جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے اور نہ ایک کی بد عملی کے لیے دوسرا جواب دہ ہو سکتا ہے۔

انسان کے لیے قدامت پسندی کا پھندا بڑا ہی سخت ہے، اس کے پیچ سے وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا۔ ہندو ہزاروں برس سے مہابھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے دو فرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ سو برس پہلے سقیفہ (بنو ساعدہ) میں خلافت کا جو انتخاب ہوا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؟ قرآن کہتا ہے، "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ" (البقرہ۔ ۱۳۴) اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ تم اپنی خبر لو۔ ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمہارے، تمہارے لیے ہیں۔

## دنیا پرستی کا غرور

دین حق دنیا کا نہیں، دنیا پرستی کے غرور و سرشاری کا مخالف ہے۔ یہی دنیا کا غرور انسان کو خدا پرستی

---

[1] ملاحظہ فرمایئے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۔ بلاشبہ اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ (آل عمران۔ ۱۹) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ (جو کوئی اسلام کے سوا دوسرے دین کا خواہش مند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ آل عمران۔ ۸۵) وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ تمہارے لیے پسند کیا دین اسلام کو۔ (مائدہ۔ ۳)

اور راست بازی سے بے پروا کر دیتا ہے۔ جب اسے طاقت اور حکومت مل جاتی ہے تو غرض و نفس کی پرستش میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے، جو دنیا میں انسان کا ظلم و فساد کر سکتا ہے۔ جو لوگ سچے خدا پرست ہیں ،وہ دنیا میں کتنے ہی مشغول ہوں، مگر ان کے پیش نظر نفس پرستی نہیں، صرف رضائے الٰہی ہوتی ہے۔

## آخرت کی نجات

آخرت کی نجات کا دارومدار تمام تر ایمان و عمل پر ہے۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے نہ کسی کی دوستی اور آشنائی کام دے سکتی ہے، نہ کسی کی سفارش سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ (کسی نیک اور بزرگ ہستی سے حسن عمل کا سبق لیا جا سکتا ہے۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اہل علم سے مسائل پوچھے جا سکتے ہیں، لیکن نجات کا انحصار اپنے ہی ایمان و عمل پر یا اللہ کی رحمت پر ہے۔ کسی کی سعی و سفارش کچھ اعانت نہیں کر سکتی۔ ایسا تصور ہی سراسر غیر اسلامی ہے۔)

## حق و باطل کا معیار

حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیار نہیں۔ گمراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں کہ نوع انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی دور نزول قرآن کے وقت بھی دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی۔ حق کی راہ یقین و بصیرت ہی کی راہ ہے نہ کہ جہل و گمان کی۔ اگرچہ بہت تھوڑے آدمی اس راہ پر کاربند ہوں۔ آج دنیا کی آبادی میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی۔ پھر کیا اس بنا پر اکثریت کے مطابق حق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ ابتدائی دور میں مسلمان بہ مشکل چند لاکھ ہوں گے لیکن انہوں نے حیرت انگیز سعی و ہمت اور نادیدہ جوش فداکاری سے چند سال کے اندر روئے زمین کے گوشے گوشے میں نور حق کا اجالا کر دیا۔ آج ان کی بھیڑ ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو باطل کی ظلمت کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بے بس نظر آتے ہیں اور وہ گروہ در گروہ ایسے طور طریقے اختیار کیے بیٹھے ہیں، جنہیں حق نہیں، باطل کے شاخسانے ہی کہا جا سکتا ہے۔

## منکرین آخرت

جو لوگ منکرین آخرتہیں یعنی محاسبہ اعمال پر اعتقاد نہیں رکھتے، ان کی ذہنیت چار حال سے خالی نہیں:

ا۔ انہیں خدا سے ملنے کی توقع نہیں۔

ب۔ وہ صرف دنیوی زندگی میں خوشنود ہوتے ہیں۔
ج۔ اس حالت کے خلاف ان کے اندر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی، اسی پر وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔
د۔ ان کے ذہن وادراک میں اس درجہ تعطل پیدا ہو گیا ہے کہ قدرت کی تمام نشانیاں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، انہیں بیدار نہیں کر سکتی۔

ان میں سے ہر بات نہ صرف بیان حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

## مشکلیں اور آزمائشیں

کتاب وحکمت کی تعلیم، شخص نبوت کی پیغمبرانہ تربیت (تزکیہ)، مرکز ہدایت کا قیام (کعبہ مکرمہ) اور بہترین امت (خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ۔ آل عمران۔ ۱۱۰)۔ ہونے کا نصب العین، یہی وہ بنیادی عناصر تھے جو موعودہ امت کی نشو ونما کے لیے ضروری تھے۔ یہ تمام مراتب ظہور میں آگئے تو پیروان دعوت قرآنی کو سرگرم عمل ہو جانے کا حکم مل گیا۔ سرگرم عمل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مشکلیں اور آزمائشیں پیش آتیں، اس لیے صبر واستقامت اور جاں فروشی کی بھی دعوت دی گئی۔

## صبر وثبات

فرمایا: "صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو"۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات ومصائب کو جھیلنے اور نفسیاتی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا کی جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر وفکر سے روح کو تقویت ملتی ہے۔ جس جماعت میں یہ دو قوتیں (صبر اور نماز) پیدا ہو جائیں گی، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔

دوسرا جو جماعت موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی، راہِ حق میں موت، موت نہیں، سرتاسر زندگی ہے۔ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب ہیں اور کتنی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں سے شکست کھا جاتی ہیں۔ فتح وشکست کا مدار افراد کی قلت وکثرت پر نہیں، دلوں کی قوت پر ہے۔ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔

## مسلمانوں کا نصب العین

مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقتور قوم بنیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت وبرتری میں جماعتی گھمنڈ اور قومی حرص وآز کا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن وسلام اور

مساوات و اخوت کے منافی تھی۔ پس صرف "خیر" اور "بہتر" ہونے پر زور دیا گیا۔ (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے۔ جس جماعت کا نصب العین یہ ہو گا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو، وہ طاقتوں کے غرور اور قومی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ (اور حق یہ ہے کہ خیر و سعادت میں سب سے بڑھ کر ہونے کے بعد کسی جماعت کی معنوی قوت میں کون سی چیز کی کمی رہ سکتی ہے اور معنوی قوت سے بڑھ کر کون سی قوت ہے جو امن و سلام کی ضامن ہو؟)

## وحدت دعوت

قرآن مجید نے دین حق کے اس اصل عظیم کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تمام نبی صرف ایک ہی دین کے داعی تھے۔ جب اللہ کا دین ایک ہے تو تمام رہنما ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جو ان میں تفریق کرتا ہے، وہ پورے سلسلہ ہدایت ہی کا منکر ہے۔ اللہ کا دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین فطرت کی اطاعت کی جائے اور آسمان و زمین میں جس قدر مخلوق ہے، سب قوانین الٰہی کی اطاعت کر رہی ہے۔ پھر اگر تمہیں اللہ کے قوانین فطرت سے انکار ہے تو اللہ کے قانون کے سوا کائنات ہستی میں اور کون سا قانون ہو سکتا ہے؟

## ایمان اور محبت

اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت دونوں لازم ملزوم ہیں۔ اگر کوئی اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے، جیسی چاہت سے ماننا صرف اللہ کے لیے ہے تو یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنا دینا ہوا اور توحید الٰہی کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔ (وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ البقرہ۔ ۱۶۵)

جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے اسے چاہیے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرے۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

## قرآن مجید کے چار وصف

سورہ یونس میں ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۝

(آیت:۵۷)

"لوگو تمہارے پاس پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے۔ دل کی بیماریوں کے لیے شفاہے اور ہدایت اور رحمت ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔"

اس میں قرآن کے چار وصف بیان کیے:

ا۔ "مَّوْعِظَةٌ" ہے یعنی دل میں اتر جانے کی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتاہے، جو خیر وحق کی باتیں ہیں۔ ان تمام باتوں سے روکتاہے جو شر وبطلان کی باتیں ہیں۔ کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت نہیں بلکہ ایسی نصیحت ہے جو موثر دلائل اور دل نشیں دلیلوں سے کی جائے۔

ب۔ "شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخہ شفاہے، جو فرد یا جو گروہ اس نسخے پر عمل کرے گا، اس کے قلوب ہر طرح کے مفاسد ور ذائل سے پاک ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ عربی میں قلب، فواد اور صدر کے الفاظ جب کبھی ایسے موقع پر بولے جائیں، جیسا یہ موقع ہے تو ان سے مقصود انسان کی معنوی حالت ہوتی ہے۔ یعنی ذہن و فکر کی قوت، عقلی ادراک، جذبات وعواطف، اخلاق و عادات، اندرونی حسیات۔ وہ عضو مقصود نہیں ہوتا، جو فن تشریح کا دل اور سینہ ہے۔

ج۔ "هُدًى" ہے یعنی یقین کرنے والوں کے لیے ایک ہدایت۔

د۔ "رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ" یقین کرنے والوں کے لیے پیام رحمت ہے، یعنی ظلم وقساوت اور بغض و تنفر سے دنیا کو نجات دلاتاہے۔ رحم ومحبت اور امن وسلامتی کی روح سے معمور کرتاہے۔

## اعلان ہی نہیں دلیل بھی

یہ محض قرآن کے اوصاف کا مدعیانہ اعلان ہی نہ تھا، بلکہ اس کی صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بھی تھا۔ اگر ایک شخص دعویٰ کرے کہ وہ طبیب ہے تو اس کے دعوے کی جانچ کا سب سے زیادہ سہل اور قطعی طریقہ یہ ہوگا کہ دیکھا جائے اس کے علاج سے بیماروں کو شفاملتی ہے یا نہیں؟ قرآن نے بھی جابجا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے۔ اس نے کہا، میں نسخہ شفا ہوں۔ ثبوت میں مومنوں اور متقیوں کی جماعت پیش کردی، جو اس کے دارالشفامیں تیار ہوئی تھی۔ آج بھی اس کی دلیل اسی طرح قاطع ہے، جس طرح عہد نزول میں تھی۔ اگر اس نے عرب جاہلیت کے مریضان روح و دل میں سے ابوبکر، عمر، علی، خالد، سلمان، ابوذر رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسی تندرست روحیں پیدا کردی تھیں تو کیا اس کے نسخہ شفامیں شک کیا جاسکتاہے؟

## صراط مستقیم اور دین قیم

سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹ میں فرمایا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ

"بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے۔"

قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیے ہیں، ان میں جامع ترین وصف یہی ہے کہ زندگی اور سعادت کے ہر گوشے میں اس کی رہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لیے ہے۔ کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا پیچ وخم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اور "الدِّيْنُ الْقَيِّمُ" (التوبہ۔۳۵) سے تعبیر کی گئی۔

## دین حق کے تین بنیادی اصول

سورۂ اعراف آیت ۲۹ میں ہے:

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۗ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

"تم کہو! میرے پروردگار نے جو حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو اور دین کو اس کے لیے خالص کر کے اسے پکارو۔"

اس آیت میں دین حق کے تین بنیادی اصول واضح کر دیے:

ا۔ عمل میں اعتدال، ۲۔ عبادت میں توجہ اور ۳۔ خدا پرستی میں اخلاص۔ یہ آیت باب توحید میں اصل اصول ہے۔ دین کو خدا کے لیے خالص کر کے پکارو یعنی دین کی جتنی باتیں ہیں وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کر دو۔ "خلق" اور "امر" دونوں اللہ ہی کی ذات سے ہیں یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور اسی کے حکم و قدرت سے اس کا انتظام ہو رہا ہے۔

## دکھاوے کی خیرات

دکھاوے کی خیرات اکارت جاتی ہے۔ جو شخص نیکی کے لیے نہیں، نام و نمود کے لیے خیرات کرتا ہے اور خدا کی جگہ انسانوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقیناً خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا۔ ایسی خیرات سے روکا گیا ہے ، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک چوری چھپے خیرات نہ کر سکو، خیرات کرو ہی نہیں یا پوشیدگی کا تعلق بجائے خود عمل خیر سے مانع ہو جائے (چھپائے رکھنا ممکن ہو تو نہ چھپانا رفتہ رفتہ ریا و نمایش کا باعث بن سکتا ہے۔ نیت پاک ہو اور خدا کی رضا کے سوا کچھ منظور نہ ہو تو کسی کے سامنے بھی خیرات کر دینا نامناسب نہیں بلکہ بعض اوقات کھلم کھلا خیرات دوسروں کے لیے وسیلہ ترغیب بن جاتی ہے۔ مقصود حقیقی یہ ہے کہ نمود و نمایش سے نیت کا آئینہ آلودہ نہ ہونے پائے)۔

نکمی اور بیکار چیزیں خیرات کے نام سے محتاجوں کو نہ دو، سوچو کہ اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے تو لینا پسند کرو گے؟

## محبت و ہمدردی کے تقاضے

نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشوو نما نہیں پاسکتی تھی، اگر اس کا حکم دیتے ہوئے ایسی باتوں سے روک نہ دیا جاتا جو ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہیں۔ پس انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کے ساتھ ساتھ سُود کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

دین حق انسانوں میں محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے خیرات کا حکم دیا کہ ہر انسان دوسرے کی احتیاج، اپنی احتیاج سمجھے۔ سود خوار کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے، وہ چاہتا ہے دوسرے کی احتیاج سے خود انتہائی فائدہ اٹھائے اور محتاج کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنائے (گویا سود خور کے دل میں ہم جنسوں کے لیے محبت و ہمدردی کا کوئی احساس باقی ہی نہیں رہتا۔)

## مومن اور امید ویقین

قرآن نے ہر جگہ حقیقت واضح کی کہ ایمان، امید اور یقین ہے، کفر، شک اور مایوسی ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ مایوس نہ ہوں۔ امید کا چراغ روشن رکھو، ہر حال میں امید وار فضل و سعادت رہو، یہی مقتضائے ایمان ہے، یہی سرچشمہ زندگی ہے۔ اسی سے تمام دنیوی اور اخروی کامرانیوں کی دولت حاصل ہو سکتی ہے۔

جس انسان نے امید ویقین کی جگہ شک ومایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے ہو، خواہ آخرت کے لیے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا اڈالے اور زندگی ختم کر دے۔

ایمان نام ہی امید کا ہے اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذہنی مزاج کسی چیز سے اتنا بیگانہ نہیں، جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اسے کتنا ہی ناکام کریں لیکن وہ پھر سعی کرے گا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اسے کتنا ہی گھیرے لیکن وہ پھر توبہ کرے گا۔ نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہو سکتا ہے، نہ آخرت کی نجات سے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے اور آخرت کی مایوسی شقاوت۔ وہ دونوں جگہ رحمت الٰہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر یقین رکھتا ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے۔ ہاں، وہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ (سورہ زمر: ۵۳)

## قبول حق کی استعداد

بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سرسبز نہ ہو گی۔ اسی طرح قرآن کی ہدایت سے بھی وہی روحیں شاداب ہوں گی جن میں قبولیت حق کی استعداد ہے۔ جنہوں نے استعداد کھو دی، ان کے حصے میں محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آباءواجداد کی اندھی تقلید، گھڑی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتدا میں جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گھڑ لیا جاتا ہے، ایک مدت تک لوگ اسے مانتے رہتے ہیں۔ جب ایک عرصے کے اعتقاد سے اس میں شان تقدیس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و بصیرت کی کوئی بھی دلیل اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو "اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ" (نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباواجداد نے گھڑ لیے ہیں) سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ بنائے ہوئے ناموں کے سوا وہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کر سکتے۔

## پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں

سورۂ اعراف کی آیت [1] میں پیغمبر اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں بیان کیں:

۱۔ نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے۔

۲۔ پسندیدہ چیزوں کا استعمال جائز ٹھہراتا ہے، ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال کو روکتا ہے، قرآن نے اس معنی میں "طیبات" اور "خبائث" کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۳۔ جو بوجھ اہل کتاب پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں وہ گرفتار ہو گئے تھے، ان سے نجات دلاتا ہے۔

یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے، جن سے قرآن نے نجات دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے: مذہبی احکام کی بیجا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں ۔ پیغمبر اسلام کی دعوت نے ان سب سے نجات دلا دی۔ سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ اور عمل کے لیے کوئی سختی نہیں۔

## درخشاں حقائق

---

[1] اس آیت ۱۵۷ کا متعلقہ حصہ یہ ہے:
یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ (پیغمبر اسلام، جس کی شفاعت تورات و انجیل میں یوں مکتوب تھیں کہ) وہ نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا۔ گندی چیزیں حرام ٹھرائے گا اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس تلے وہ دبے ہوں گے۔ ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

چند حقائق ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ قرآن کے نزدیک کسی جماعت کے مسلمان ہونے کی عملی شناخت دو باتیں ہیں: نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کا نظام، جو جماعت یہ دو عمل ترک کر دے گی (وہ عملاً) مسلمان متصور نہ ہو گی۔ زکوٰۃ کے نظام سے مراد ہے کہ حکومت یہ انتظام نہ کر سکے یا کسی جگہ مسلمان خدا نخواستہ محکوم ہو جائیں تو وہ خود زکواۃ کا نظام سنبھالیں۔

اس آیت کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

۲۔ شرف و بزرگی کے رسمی مناصب کوئی چیز نہیں۔ بزرگی اسی کے لیے ہے جو عمل و ایمان کی بزرگی رکھتا ہے۔

۳۔ قرآن کے نزدیک سب سے بڑا درجہ ان انسانوں کا ہے جو ایمان و حق پرستی کی راہ میں قربانیاں کرنے والے ہیں، نہ کہ ان لوگوں کا جو رواجی نیکیوں اور رسمی نمائشوں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

۴۔ مومن وہ ہے جس کی حب ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت غالب نہ آسکے۔

۵۔ جماعت کی زندگی اور فتح و کامرانی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں کہ مذبذب اور وردلے آدمی اس میں موجود ہوں۔

۶۔ کاروبار حق میں دارومدار شخصیتوں پر نہیں۔ شخصیت اس لیے ہے کہ بیج بودے۔ باقی رہے برگ و بار، تو ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی ہی میں سب نمودار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ زندگی میں، کچھ اس کے بعد ہوں۔ اس تاخیر سے کاروبار حق پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۷۔ حلت و حرمت اشیاء میں قرآن کے اصول اربعہ:

الف۔ اصل اباحت ہے نہ کہ حرمت، الا یہ کہ وحی الٰہی نے کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیا ہو۔

ب۔ کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینے کا حق خدا کی شریعت کو ہے۔

ج۔ محض اپنی رائے اور قیاس سے کوئی چیز حرام ٹھہرانا افترا علی اللہ یعنی خدا پر بہتان باندھنا ہے۔

د۔ انسان کے عقائد و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے، نہ کہ وہم و گمان پر۔

## تذکیر و توکیل

پیغمبر کا کام "تذکیر" و "تبلیغ" ہے "تبشیر" و "تنذیر" ہے۔ وہ داعی اور مذکر ہے۔ "وکیل" یعنی نگہبان نہیں جو زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جائے، پھر اس سے نکلنے نہ دے۔ سورۂ یونس میں ہے: وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (میں تم پر نگہبان نہیں۔ یونس:۱۰۷)۔ دوسری جگہ پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب

یوں ادا کیا: وَ مَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِجَبَّارٍ (تو ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں کہ جبراً و قہراً بات منوادے ق:۴۵) نیز فرمایا: لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ (تجھے ان پر داروغہ بنا کر نہیں بٹھادیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انہیں راہ حق پر چلادینے کا ذمہ دار ہو۔ غاشیہ:۲۳) پھر فرمایا: فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ (جو کچھ تیرے ذمے ہے یہی ہے کہ پیغام پہنچا دیا جائے۔ ان سے ان کے کاموں کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔ رعد:۴۰)

قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب تذکیر و تبلیغ کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ خدا کی طرف سے مامور تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی دوسرے شخص کے لیے وہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وکیل، مصیطر اور جبار بن جائے۔

## تذکیر و تبلیغ اور پسند و قبول

دراصل اعمال انسانی کے تمام گوشوں میں اصل سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے، یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا۔ دو حق ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ ایک حق ہے تذکیر و تبلیغ کا، ایک پسند و قبولیت کا۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے، اسے دوسروں کو بھی سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں کہ دوسروں کے حق سے انکار کردے۔ یعنی یہ بات بھلادے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے اور ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں۔

تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلاف عقائد کی بنا پر ذبح نہ کرے۔ اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" و "توکیل" میں فرق ہے۔ اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے "اعلان حقوق انسانی" سے شروع نہیں ہوئی۔ اس سے بارہ سو برس پہلے (نزول قرآن کے ساتھ) شروع ہو چکی تھی۔

## خوف و حزن

قرآن نے اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بھی بات اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ "وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ" (اور یہ قرآن میں کئی مقامات پر ارشاد ہوا ہے۔ البقرہ۔۶۲) یعنی وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا اور اس کی

شقاوت کی ساری سرگزشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے: خوف اور دکھ۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی، اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے کانٹے بھی ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو، خواہ جسم میں چھبے ہوں، خواہ دماغ میں، خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں، خواہ آخرت کی۔ تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں، یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے، جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

## عقل اور ماورائے عقل

قرآن اس بات کی بھی مذمت کرتا ہے کہ علم و بصیرت کے بغیر کوئی بات مان لی جائے اور اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلا دی جائے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی بات ہے۔ یا تو وہ عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے، یا پھر سمجھ بوجھ کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی، جھٹلا دی۔ اس طرح حقیقت کے اثبات و وجود کا مدار صرف ایک خاص فرد کی سمجھ پر رہ گیا۔

صورتیں دو ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو۔ ایک یہ کہ تمہاری عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں، جن کا احاطہ تمہاری سمجھ نہیں کر سکتی، لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سرے سے خلاف عقل ہیں۔ اس لئے کہ اول تو افراد کی عقلی قوت یکساں نہیں، ثانیاً عقل انسانی برابر نشو و ارتقا کی حالت میں ہے۔ ایک عہد کی عقل جن باتوں کا اثبات نہیں کر سکتی دوسرے عہد کے لیے وہ عقلی مسلمات بن جاتی ہیں۔ ثالثاً انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم ہو جاتی ہے۔

## مرد عورت کی اخلاقی مساوات

قرآن نے مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تصریح کر رہی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی

راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔[1] چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح ایمان والی عورتیں ہیں۔ جس طرح اطاعت گذار مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانت عورتیں ہیں، جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بہ کثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بہ کثرت ذکر کرنے والیاں ہیں۔

## قرآن کریم کی شہادت

مردوں کے لیے فرمایا:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (سورۃ توبہ: ۱۱۲)

”(اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے) توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے، سیر و سیاحت کرنے والے، رکوع و سجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے۔“

عورتوں کے لیے بھی فرمایا:

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ (سورہ تحریم:۵)

”مسلم عورتیں، مومن عورتیں، فرمانبردار، توبہ کرنیوالیاں، عبادت کرنے والیاں، سیر و سیاحت کرنے والیاں۔“

منافقوں کا ذکر کیا تو دو جنسوں کا کیا“

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (سورہ توبہ: ۶۷)

”منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک دوسرے کے ہم جنس، برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔“

پھر فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ

---

[1] اشارہ ہے اس آیت کی طرف: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (النساء۔ ۳۲) ”مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے۔ اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے“۔

وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

(سورۃ احزاب: ۳۵)

"مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق پر کاربند مرد اور صدق پر کاربند عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور اپنی حفاظت کرنے والے پاکباز مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی پاکباز عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور بہت ذکر کرنے والی عورتیں۔ ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور بڑا درجہ ہے۔"

غور کرو کسی وصف میں تفریق نہیں، کسی فضیلت میں امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ بد اخلاق ہے؟

## صبر اور شکر

"صبر" کے معنی ہیں مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلوں میں جمے رہنا۔ "شکر" کے معنی ہیں اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں (اور نعمتوں) کی قدر کرنا اور انہیں ٹھیک ٹھیک کام میں لانا۔ خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم (مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں ثبات و استقامت پر استوار رہتی ہے اور) خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجالاتی ہے اور ان سے ٹھیک طور پر کام لیتی ہے۔ خدا اسے اور نعمتیں عطا فرماتا ہے، لیکن جو کفران نعمت کرتی ہے یعنی قدر شناسی نہیں کرتی، محرومی و نامرادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے، جو کسی انسانی گروہ کے حصے میں آتا ہے۔

غور کرو یہ حقیقت حال کی سچی تعبیر ہے کہ جو فرد یا گروہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے مثلاً خدا نے اسے فتحمندی و کامرانی عطا فرمائی ہے وہ اس نعمت کو پہچانتا، اسے ٹھیک طور پر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل نہیں ہوتا، وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہو جاتا ہے یا نہیں؟ جو ایسا نہیں کرتا، اس کی نامرادی و تباہی میں کوئی شک ہو سکتا ہے؟

## اکتساب مال اور انفاق مال

ہر انسان کی ذہنی و جسمانی استعداد یکساں نہیں ہوتی، اس لیے وسائل معیشت کے حصول کے اعتبار سے بھی سب کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع حاصل ہو گئے کسی کو تھوڑے۔ پہلے

قوت میں مقابلہ ہوا، طاقتور نے کمزور کو مغلوب کر لیا۔ پھر ذہن و جسم کا مقابلہ شروع ہو اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کر لیا۔

قرآن اس صورت حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ حیثیت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں، لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ حصول و رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو اور کسی کو ملے، کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا، دنیا کے سامان رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے۔

دراصل قرآن کی اس تہ میں یہ بنیادی اصل کام کر رہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور منقسم تسلیم نہیں کرتا، بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے شریک حال ہیں۔

(قرآن) کہتا ہے کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تم انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ تم جس قدر کما سکتے ہو کماؤ، لیکن یہ نہ بھولو کہ زیادہ سے زیادہ کمانا، زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں، لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے۔

غرض جہاں تک نظام معیشت کا تعلق ہے۔ قرآن نے اکتساب مال کا معاملہ، انفاق مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اس لئے کوئی کمائی جائز نہیں تسلیم کی جا سکتی، اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے، قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحق عقوبت ہے۔

## بدعملی کا بڑا مرکز

انفرادی زندگی میں بدعملی کا بڑا مرکز دنیوی خوشحالی کی زندگی ہے۔ خوشحالی و ثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی برکت نہیں اور اگر صرف چند افراد میں سمٹی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ کیونکہ جب دولت صرف چند افراد کے قبضے میں آگئی، باقی افراد جماعت محروم رہ گئے تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ و تسلط چند افراد کے ہاتھ آجائے گا اور ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرور باطل اور استکبار عن الحق ہے (اس صورت حال کی الم انگیز مثالیں ہر طرف موجود ہیں)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس جماعتی خوشحالی کو اللہ کا سب سے بڑا فضل قرار دیتا ہے، اسی کو انفرادی

حالت میں "فتنہ" اور "متاع غرور" بھی کہتا ہے۔

آج تمام دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ انفرادی سرمایہ داری دنیا کے لیے مصیبت ہے، لیکن قرآن چودہ سو برس پہلے اسے "فتنہ" قرار دے چکا اور اس کے لیے اکتناز کا لفظ بول چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا (سورۃ توبہ: ۳۴)

"اور جو لوگ چاندی اور سونا اپنے ذخیروں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے ۔"

مشکل یہ ہے کہ جب تک قرآن کی صدا قرآن کی صدا ہے تمہاری نظروں میں چبھتی نہیں، جب وہی بات وقت کے ذہن و فکر سے اٹھنے لگتی ہے تو فوراً اس کی پرستش شروع کر دیتے ہو۔

## فضیلت و کامرانی کے طریقے

سورہ اعراف میں ہے:

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۚ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ (آیت ۱۹۸۔ ۱۹۹)

"(اے پیغمبر) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو ہرگز تمہاری پکار نہ سنیں۔ تمہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری طرف تک رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں (بہرحال) نرمی و گزر سے کام لو، نیکی کا حکم دو، جاہلوں کے طرف متوجہ نہ ہو۔"

(دیکھیے) چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کر دے۔ "خُذِ الْعَفْوَ"، "امر بالمعروف" اور "اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ" یعنی نا سمجھوں کی نا سمجھی بخش دینا، نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا اور جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا۔ سرسری نظر میں پتا نہیں لگے گا، اچھی طرح اور بار بار غور کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کی ساری عملی مشکلات ان تین اصلوں سے حل نہیں ہو جاتیں؟

آیت ۱۹۸ میں فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ تجھے دیکھتے نہیں کیونکہ اگر دیکھتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ سو ایک دیکھنا سلمان رضی اللہ عنہ فارسی کا تھا، جو پہلی ہی نگاہ میں پکار اٹھا: واللہ ما ھذا الوجہ وجہ الکذاب (خدا کی قسم یہ صورت جھوٹے آدمی کی ہو نہیں سکتی) اور ایک دیکھنا ابوجہل کا تھا کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (یہ کیسا نبی ہے کہ آدمیوں کی طرح غذا کا محتاج ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے؟ الفرقان:۷)

## وفائے عہد اور قرآن

عہد جاہلیت کے عرب وفائے عہد کی اخلاقی قدر و قیمت سے بے خبر نہ تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اپنے اور اپنے قبیلے کے مفاخر میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ وفائے عہد کو دیتے تھے، لیکن جہاں تک جماعتی معاہدوں کا تعلق ہے، وفائے عہد کا عقیدہ کوئی عملی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک قبیلہ ایک قبیلے سے معاہدہ کرتا تھا، کل دیکھتا تھا کہ اس کے مخالف زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں تو بے دریغ ان سے جاملتا تھا اور معاہد و حلیف پر حملہ کر دیتا تھا۔ اگر کسی دشمن فریق سے (عہد جاہلیت کے عرب) امن کا معاہدہ کرتے، پھر دیکھتے کہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع پیدا ہو گیا ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی معاہدے کا احترام انہیں حملہ کر دینے سے نہیں روکتا تھا اور بے خبر دشمن پر جا گرتے تھے۔

قرآن راستبازی کی جو روح پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک لمحے کے لیے بھی ایسی بد اخلاقی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وفائے عہد اور احترام پیمان کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس درجہ بلند، قطعی، بے لچک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی بھی گوشہ اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فرد ہو یا جماعت، ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہوں یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہوں یا غیر ہم قوم و مذہب، دوست ہوں یا دشمن، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، لیکن کسی بھی حال میں عہد شکنی جائز نہیں، وہ ہر حال میں جرم ہے، معصیت ہے۔ اللہ کے ساتھ ایک بات کر کے اسے توڑ دینا ہے عذاب عظیم کا اپنے کو مستحق ثابت کرنا ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا وفائے عہد پر زور دیا ہے اور جہاں کہیں مومنوں کے ایمانی فضائل کی تصویر کھینچی ہے، یہ وصف سب سے زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے:

۱۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (البقرۃ: ۱۷۷)

"اور جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اس کا پاس کرتے ہیں۔"

۲۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾ (المؤمنون ـ ۸)

"نیز جن کی حالت یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔"

احادیث میں منافق کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے: اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ: "جب وعدہ کرے گا پورا نہ کرے گا۔"

سورۃ نحل آیت ۹۲ میں فرمایا:

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ

"تم آپس کے معاملے میں اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو، اس لیے کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یاد رکھو) اس معاملے میں اللہ تمہاری (راستبازی اور استقامت کی)

آزمائش کرتا ہے۔"

پھر اس طرح کی بد عہدی کی مثال کیا ہے؟ فرمایا:

كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (اس عورت کی سی ہے جس نے بڑی جانفشانی سے سوت کاتا، پھر خود ہی اسے ٹکڑے کرکے برباد کر دیا۔ النحل۔۹۲) یعنی جب ایک شخص یا ایک گروہ کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کی پختگی کے لیے بڑی باتیں کرتا ہے۔ ہر طرح دوسرے فریق کو یقین دلاتا ہے۔ پھر اگر ایک بات اتنی کوشش کے بعد پختہ کی گئی ہے تو کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے کل پختہ کی تھی، وہی آج اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ کر رکھ دے۔

## رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی شان رافت و رحمت

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ (توبہ:۱۲۸۔۱۲۹)

"تمہارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ وہ مومنوں کے لیے شفقت اور رحمت رکھنے والا ہے اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں مگر اس کی ذات، میں نے اسی پر بھروسا کیا وہ تمام عالم ہستی (کی جہانداری) کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔"

ان دو آیتوں میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا: اللہ کا رسول تم میں آگیا اس نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آنکلا تھا۔ سنت الٰہی کے مطابق خود تمہیں میں پیدا ہوا اور چونکہ تمہیں میں سے ہے، اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گزرا اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس نے تم سے کہیں چھپ کر زندگی بسر نہیں کی، اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے پھر جو کچھ گزرنا تھا، گزرا۔ تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سن لیے۔ فتح و کامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی آزمانہ لی ہو۔

پھر (رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے) ایک ایسے وصف پر زور دیا، جو منصب رسالت کے لیے اور ہر اس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو، سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت۔ فرمایا: اس سے زیادہ کوئی بات تمہارے لیے یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا شفقت و

رحمت ہے۔ وہ تمہارا دکھ برداشت نہیں کر سکتے۔ تمہاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو، خواہ روح کے لیے، اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کے لیے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اس کی بن پڑتی تو ہدایت وسعادت کی ساری پاکیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتا۔ پھر اس کی یہ شفقت ومحبت تمہارے ہی لیے نہیں وہ تو تمام مومنوں کے لیے خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے "رؤف رحیم" ہے۔

"رؤف" "رافت" سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری اور مصیبت پر جوش میں آئے۔ پس رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت وتاثیر کے ساتھ واضح ہو گیا۔

خدا نے یہ دونوں وصف جابجا اپنے لیے فرمائے ہیں اور یہاں اپنے رسول کے لیے بھی فرمائے۔

## پیام موعظت کی ضرورت

اس کے بعد مجمع مخاطبین یہ سب کچھ دیکھ لینے اور تجربہ کر لینے کے بعد بھی ادائے فرض سے اعراض کرے تو اسے پیغمبر تم آخری اعلان کرو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا تھا اور اب بھی بس کرتا ہے۔ وہ اپنے کلمہ حق کا محافظ ہے اس کی مشیت نے جو فیصلہ کر دیا ہے بہرحال ہو کر رہنے والا ہے۔ اس کا قیام وعروج کسی خاص ملک اور قوم کی پشت پناہی پر موقوف نہیں۔ میرا بھروسہ اللہ ہی پر تھا، اسی پر ہے، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

یہ پیام موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا؟ اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں: سورۃ (یعنی سورۃ توبہ) کے نزول کا وقت اور سورۃ کے مطالب۔ یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمۂ حق سربلند ہو چکا تھا اور گو قرآن کی عالمگیر فیروز مندیوں کی خبر دے دی تھی، تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بیکسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں بعض سے جو تساہل ہوا اس کی تہ میں بھی اس حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ میں اس تفصیل اور شدت کے ساتھ استعداد کار اور عزم وہمت کی گئی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسری سورۃ میں نہیں ملتی۔

## تاریخ انسانیت کے نوادر

کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے، لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ

واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں کہ ان سے انکار کیا جا سکے۔ ازاں جملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر اسلام صلعم کی مخالف تھیں، ان کے تمام کام اول سے آخر تک ظلم و تشدد، دغا و فریب اور وحشت و تشدد پر مبنی رہے اور پیغمبر اسلام صلعم اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک ایک فعل، صبر و تحمل، راستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا:

۱۔ مظلومی میں صبر۔

۲۔ مقابلے میں عزم۔

۳۔ معاملے میں راستبازی۔

۴۔ طاقت و اختیار میں درگزر۔

تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے (جس طرح رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکت کے اندر جمع ہوئے اور پورا عہد مبارکہ نبوت ان نوادر کی درخشانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ گویا سیرۃ طیبہ کا نچوڑ یہی ہے جو حقیقت میں انسانیت عالیہ و عظمیٰ کا سدرۃ المنتہیٰ ہے)۔

## "نذیر" و "بشیر"

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت و بندگی کی سطح سے بلند کر کے دیکھیں۔ لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام ﷺ کی حیثیت صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کر دی کہ ہمیشہ کے لیے اس گمراہی کا ازالہ ہو گیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے۔

جو دنیا پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہشمند تھی، اسلام کے پیغمبر ﷺ نے اس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کر لو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی نسبت جو بات سنائی، یہ تھی کہ میں انکار و بد عملی کے نتائج سے خبر دینے والا "نذیر" اور ایمان و نیک عملی کی برکتوں کی بشارت دینے والا "بشیر" ایک بندہ ہوں، اگر غیب داں ہوتا تو زندگی کا کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا:

کیا ایسے انسان کی زبان سے سچائی کے سوا کوئی بات نکل سکتی ہے؟

چہ عظمت دادہ ای یا رب بخلق آں عظیم الشاں
کہ "انی عبدہ" گوید بجائے قول "سبحانی"

# رحمت و شفقت کا ابر گہر بار

## آدمیت احترام آدمی

### ہدایت کے لیے لامتناہی تڑپ

رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک میں مخلوق کے لیے بے پایاں شفقت ورحمت کا جو سمندر موجزن تھا، اس کا ذکر کتاب میں پے در پے آتا رہا ہے، ساتھ ساتھ مثالیں پیش ہوتی رہی ہیں۔ باقی رہی شفقت ورحمت کی مفصل کیفیت تو اگر میں بیان کرنا بھی چاہوں تو الفاظ اور بیان مطالب کی صلاحیت کہاں سے لاؤں؟ وہی ایرانی شاعر کا معاملہ ہے:

کتاب فضل ترا آب بحر کافی نیست
کہ تر کنم سر انگشت وصفحہ بشمارم

ہمارے لیے کلام الٰہی سے بڑھ کر قاطع، فیصلہ کن اور دل پذیر شہادت کوئی نہیں ہو سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (کہف:٦)

”(اے پیغمبر تری حالت تو یہ ہو رہی ہے کہ) اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائیں تو عجب نہیں تو ان کے پیچھے افسوس کے مارے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔“

کیا خلق خدا کی دنیوی اور اخروی بہبود کے لیے انتہائی محبت و شیفتگی کی کوئی روشن تر شہادت ہو سکتی ہے۔ جس کا دائمی ذکر اس کتاب مقدس میں محفوظ ہو گیا۔ جو ذکر ؐ للعٰلمین ہے؟ یہ غمگینی اور اندوہنا کی روئے زمین کے تمام انسانوں اور پوری نوع بشر کے لیے تھی، خواہ ان کا تعلق کسی نسل، کسی خطے اور کسی قوم سے تھا۔

انبیائے کرام ہدایات اصلاح کے طالب ہی نہیں، عاشق ہوتے ہیں۔ انسانوں کی گمراہی ان کے دلوں کا ناسور ہوتی ہے اور ہدایت کا جوش ان کے دل کے ایک ایک ریشے کا عشق۔ اس سے بڑھ کر ان کیلیے

کوئی غمگینی نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان سچائی سے منہ موڑ لے اور اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی شادمانی نہیں ہو سکتی کہ ایک گمراہ قدم راہ راست پر آجائے۔ قرآن میں اس صورت حال کی شہادتیں جابجا ملتی ہیں
۔

## غور طلب حقائق

آپ نے اس صورت حال کے اسباب پر بھی کبھی غور فرمایا؟ یہ خیال کر لینا تو انتہا درجے کی سخافت و کم عقلی کا ثبوت ہو گا کہ داعی حق ایک انسان نما مشین ہوتا ہے جو اوپر سے نازل شدہ ہدایات کو خلق خدا کے سامنے دہراتا رہتا ہے، حاشا و کلا۔

۱۔ مشیت ایزدی جن مقدس ہستیوں کو دعوت حق کے لیے چنتی رہی ان کی فطرتیں ہم جنسوں کی اصلاح و فلاح اور سود و بہبود کے غم میں سراپا سوز و درد ہوتی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی داعی حق روزگار کی حد درجہ حوصلہ فرسا مشکلات کے باوجود اپنے وظیفے کی بجا آوری پر چٹان کی طرح جما کیونکر رہ سکتا تھا؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی ناسازگار حالات میں یہ کیوں فرماتے کہ خدا کی قسم' اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں، تب بھی میں اپنے فریضۂ دعوت سے باز نہ آؤں گا، یہاں تک کہ خدا اس کام کو پورا کر دے یا خود میں اس پر نثار ہو جاؤں۔

۲۔ قرآن مجید اس حقیقت کی پے درپے گواہی دے رہا ہے کہ ہر داعی حق نے آغاز دعوت کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ میں اس کام کے لیے کسی سے اجر کا طلبگار نہیں۔ میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔ اگر ہر داعی حق کے قلب مقدس میں ہم جنسوں کو راہ راست پر لانے کے لیے انتہائی تڑپ نہ ہوتی تو ہر قسم کی ذاتی اغراض سے کامل برات کا دعویٰ کیوں بار بار زبان پر لایا جاتا؟

۳۔ پھر ہر داعی حق پر ایک ایک فعل اور ایک ایک حرکت کے نتائج و عواقب برای العین آشکارا ہوتے ہیں۔ انجام بد کا تصور ایک شے ہے، انجام بد کی تلخیوں اور ناخوشگواریوں کا مشاہدہ بالکل دوسری شے ہے۔

۴۔ اگر کسی کا قدم گمراہی میں بڑھتا جائے تو عام لوگ سمجھیں گے کہ وہ از روئے شریعت عذاب کا سزاوار ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بخش دے تو دوسری بات ہے، لیکن داعی حق پر معاملہ جزا اسی طرح عیاں ہوتا ہے جس طرح سلیم البصارت آدمی کو دن کے وقت آفتاب نظر آتا ہے۔ پھر ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت و رحمت کی بناء پر سب کو تعزیر و عقوبت کی حوصلہ فرسائیوں اور شکیب گدازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے داعی حق جس غمگینی و اندوہناکی اور جس اضطراب و بے تابی کا تختہ

مشق بنتا ہوگا، اس کی شدت اور وسعت حدود ہمارے محدود اور آلودہ اغراض ذہنوں میں کیونکر سما سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ میں تمہیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں مگر تم آگ میں گر پڑتے ہو۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ تمام مکارم و فضائل نبوت کے جامع تھے، کیونکہ آپ ﷺ پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے معبوث ہوئے تھے، اس لیے تمام خصوصیات میں بھی سب سے افضل تھے۔ سورۃ کہف کی محولہ بالا آیت کے دو پہلو ہیں اور دونوں بہ ہر حال ہر اس فرد کے پیش نظر ہونے چاہئیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات سے انتساب کا مدعی ہو:

الف: یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے جوش دعوت واصلاح اور نوع بشر کے لیے بے پایاں شفقت کا صحیح نقشہ پیش کر رہی ہے۔

ب۔ ہر مدعی اسلام کا فرض ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" کی پیروی میں حضور ﷺ کی ان خصوصیتوں (جوش دعوت و اصلاح اور بے پایاں شفقت و رحمت) کا بھی بہتر عملی پیکر بنے۔

## واقعہ طائف

حضور ﷺ کے سفر طائف کا ذکر کرتے ہُوئے عرض کیا جا چکا ہے کہ دعوت حق کی جو سرگزشت دُنیا کے مذہبی دفتروں اور سفینوں میں محفوظ ہے، اس میں سے کوئی ایسا واقعہ دکھایا نہیں جا سکتا جو طائف میں حضور ﷺ کی دعوت حق کا مثیل بن سکے، دیکھیے:

۱۔ سفر طائف کا مقصد اس کے سوا کیا تھا کہ اہل طائف ہدایت کی راہ پر لگ جائیں؟ اس میں انہی لوگوں کی بھلائی اور بہتری تھی، دنیوی بھی اور اخروی بھی، حضور ﷺ نے صرف فریضۂ تبلیغ ادا کرنے میں ہر زحمت گوارا فرمائی تھی۔

۲۔ طائف کے گمراہ اور حق ناشناس رئیسوں نے حضور ﷺ سے جو سلوک روا رکھا وہ ہر زاویہ نگاہ سے ظلم و تعدی کا ایک نہایت افسوسناک مظاہرہ تھا۔ عرب کے دورِ جاہلیت میں ایسے مظاہروں کی کہیں بھی کمی نہ تھی۔

۳۔ ان رئیسوں کی انگیخت پر اوباشوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنگ باری کا ہدف بنایا، یہاں تک کہ پیشانی مبارک کا خون بہ بہ کر پائے مبارک تک پہنچ گیا اور آپ ﷺ نے ایک باغ میں پناہ لی۔

۴۔ اس دردناک حالت میں بھی آپ ﷺ کے قدوسی تحمل پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس موقع پر بارگاہ باری تعالیٰ میں جو دُعا کی، وہ اپنے محل پر منقول ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا جس سے

تلخی وناخوشگواری کی بُو سُونگھی جاسکے۔ اللہ کی لگن کے سوا حضور ﷺ کے قلب صافی میں اور کسی چیز کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔

۵۔ پھر یہ بھی فرمایا: میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے کیوں دُعا مانگوں؟ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہُوا، ان کی آئندہ نسلیں ضرور ایک خدا پر ایمان لائیں گی۔

کیا اپنے پیغام کی صداقت پر بے پایاں یقین اور ہم جنسوں کے لیے بے پایاں رحمت کی ایسی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ کیا ہدایت کی لامتناہی امید کا کوئی ایسا نقشہ آپ کو کسی دوسری جگہ نظر آسکتا ہے؟

تاریخ گواہ ہے کہ آئندہ نسلیں نہیں، خود وہ نسل بھی حضور ﷺ کے دست مبارک پر ایمان لائی، جس کے ہاتھ چند سال پیشتر حضور ﷺ کو سنگ باری کا نشانہ بنا چکے تھے۔ یقین رکھیے واقعہ طائف اپنی معنوی بے مثالی ہی کی بن پر سیرۃ طیبہ کا ایک اہم موڑ بن گیا، جہاں سے ہجرت کے مقدمات شروع ہوگئے اور دین حق کی دعوت اس منزل کے دروازے پر پہنچ گئی، جس میں "يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝" (النصر۔ ۲) کا نظارہ مہر وماہ کی آنکھوں کے لیے جشن عید بننے والا تھا۔

## عہد نبوی ﷺ کی جنگیں

ہم جنسوں کے لیے بے پایاں شفقت ورحمت کی ایک روشن دستاویز عہد نبوی کی جنگیں بھی ہیں، جن کی حقیقی حیثیت اور معنوی خصوصیت پر اب تک بہت کم توجہ فرمائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی بھی دور میں جنگ کے خواہاں نہ تھے جو دین عالم انسانیت کے لیے صلح وامن، محبت واخوت اور فلاح وبہبود کا پیغام تھا، اس میں رزم وپکار کے لیے کون سی گنجائش ہو سکتی تھی؟ لیکن قریش مکہ کے غرور وتکبر اور ظلم وجور نے شریف وحق پرست انسان کے لیے جینا دوبھر کر دیا، حالانکہ ان کی نکوکاری حق پرستی اور شرافت کسی کے لیے بھی باعث تکلیف نہیں ہو سکتی تھی، مجبور ہو کر پہلے ایک جماعت کو حبش جانے کی اجازت دے دی گئی۔ قریش مکہ نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا انتظام ہُوا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام پشتوں کے گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے لیکن یہ بُعد مکانی بھی قریش کی آتش اشتعال روک نہ سکا۔ بلکہ ان کی پیش دستیوں اور آزار رسانیوں کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔ ان حالات میں حفظ ودفاع اور پیش بندیوں کے سوا چارہ نہ رہا اور حفظ ودفاع اس دنیا میں ہر فرد وجماعت کا اولین فطری حق ہے، جس پر امن عالم کا انحصار ہے۔

## غزوات وسرایا

رسول اللہ ﷺ کو جن مہموں سے سابقہ پڑا انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن مہموں کی

قیادت حضور ﷺ نے بہ نفس نفیس فرمائی انھیں غزوات کہتے ہیں، جن مہموں کی سر عسکری پر دوسرے اصحاب مامور ہُوئے انہیں سرایا (جمع سریہ) کہا جاتا ہے۔

قاضی محمد سلیمان مرحوم منصور پوری نے "رحمتہ للعٰلمین" کی دوسری جلد میں بیاسی غزوات، سرایا کا ذکر نام بنام کیا ہے اور ان کی تفصیلات بتائی ہیں ا۔ بعض کتابوں میں اس سے بہت کم تعداد کا ذکر ہوا ہے لیکن اصل سوال تعداد کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے۔ ان سب کو عموماً غزوات یا سرایا ہی قرار دے لیا گیا ہے حالانکہ ان میں سے اکثر ایسی تھیں، جنھیں کسی بھی زاویہ نگاہ سے جنگیں سمجھنا یا جنگیں قرار دینا صحیح نہ ہو گا۔ مثلاً ابن حزمؒ نے حدیبیہ کو بھی غزوہ قرار دیا ہے حالانکہ نہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے ارادے سے نکلے تھے، نہ جنگ کی نوبت آئی۔ آپ ﷺ صرف عمرہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ جس کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور حضور ﷺ کا یہ سفر ذی قعدہ میں ہوا تھا، جو اشہر الحرم میں سے تھا یعنی جس میں کشمکش یا روک تھام قریش کے لیے جائز ہی نہ تھی۔ قاضی سلیمان مرحوم نے انھیں مہمیں بھی نہیں کہا بلکہ محض "نقل و حرکت" قرار دیا ہے اور یہ تعبیر ان میں سے اکثر کی حقیقی کیفیت کی صحیح آئینہ دار ہے۔

## مہموں کی نوعیت

قاضی سلیمان مرحوم کی بیان کردہ بیاسی مہموں میں سے بیشتر کی کیفیت خلاصتہً ذیل میں درج کی جاتی ہے:

ا۔ ان میں سے بعض کو جنگیں قرار دینا واقعتہً غلط ہے۔ مثلاً رجیع اور بئر معونہ کی طرف جو لوگ بھیجے گئے وہ نہ فوجی دستے تھے نہ اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ لڑیں۔ وہ محض مبلغ اور مقرری تھے، اس وجہ سے بھیجے گئے تھے کہ لوگوں نے قرآن اور اسلام سیکھنے کی غرض سے ان کے ارسال پر اصرار کیا تھا۔ بئر معونہ بھیجے جانے والے لوگوں کے لیے ایک رئیس قبیلہ نے ذاتی ضمانت بھی قبول کرلی تھی۔ یہ کل اسی (۸۰) افراد تھے۔ ستر بئر معونہ اور دس رجیع بھیجے گئے۔ ان دونوں جماعتوں کو اچانک غداری سے سابقہ پڑا۔ اسی (۸۰) میں سے صرف ایک محفوظ رہا، باقی سب نے شہادت پائی، ان کا نقصان بھی جنگی نقصانات میں محسوب نہیں ہو سکتا۔

۲۔ پھر ان میں سے خاصی مہمیں ایسی تھیں جن میں بہت کم آدمی بھیجے گئے، اتنے کم کہ انھیں جنگوں میں شامل کرنا مضحکہ خیز ہو گا۔ مثلاً:

| آدمی | مہمیں |
|---|---|
| ایک ایک | ۵ |
| پانچ پانچ | ۲ |

| | |
|---|---|
| دس دس | ۲ |
| بارہ بارہ | ۲ |
| پندرہ پندرہ | ۳ |
| بیس بیس | ۴ |
| پچیس پچیس | ۲ |
| تیس تیس | ۵ |
| چالیس چالیس | ۲ |

گویا ستائیس مہموں میں اتنے تھوڑے آدمی بھیجے گئے کہ انھیں جنگیں کہاہی نہیں جاسکتا۔ یہ دراصل طلایہ گرد دستے تھے، جو اس وجہ سے وقتاً فوقتاً اطراف میں بھیجے گئے کہ دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق معلومات حاصل کریں تاکہ اس کے مفسدانہ منصوبوں سے آگاہ ہو کر مناسب دفاعی تدبیریں عمل میں لائی جاسکیں یا کہیں کوئی فتنہ انگیز فرد قتل وغارت کے عادی قبیلوں کو برانگیختہ کرکے مدینہ منورہ پر چھاپا مارنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ایک جانباز گیا اور اس فتنہ انگیز کو ''وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ'' (البقرہ۔۲۱۷) کے اصول پر ختم کرکے چلا آیا اور وہاں لوگ امن چین سے بیٹھ گئے۔

۳۔ حدیبیہ کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ جنگ تھی ہی نہیں، اس کا مقصد ادائے عمرہ تھا۔ آخر قریش سے دس سال کے لیے صلح ہوگئی نیز قرار پاگیا کہ مسلمان آئندہ سال آکر عمرہ ادا کرلیں۔ قریش تین روز کے لیے شہر مکہ سے نکل کر آس پاس کے پہاڑوں میں جابیٹھیں گے۔

۴۔ بعض مہمیں اس وجہ سے تیار ہوئیں کہ دشمن کے چھاپا مار دستے اچانک حملہ کرکے چند امن پسند شہریوں کو خاک وخون میں تڑپا چکے تھے، ان کا تعاقب کیا گیا۔ ایسی مہمیں بھی عرفاً جنگ نہیں سمجھی جاسکتیں۔

۵۔ بعض مہمیں اطراف مدینہ کے قبیلوں کے پاس گئیں اور ان سے معاہدہ ہائے صلح وامن کرلیے۔ ان معاہدوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن کی فتنہ انگیزی کا دائرہ محدود کر دیا جائے اور قبیلوں کو دشمن کی عیاریوں کا تختہ مشق نہ بننے دیا جائے۔

۶۔ ایک مثال ایسی بھی ہے کہ کچھ لوگ باہر سے آئے جو بیمار تھے انھیں رحم کھا کر مدینہ کی چراگاہ میں ٹھہرا دیا گیا تاکہ کھلی آب وہوا میں رہیں اور اونٹنیوں کا دودھ پیءں۔ وہ تندرست ہوگئے لیکن دور جاہلیت کے احسان ناشناسوں کی طرح انہوں نے چراگاہ کے رکھوالے کو شہید کرڈالا اور اونٹ ہنکالے گئے۔ ان کا بھی تعاقب کرکے انہیں پکڑا اور مناسب سزا دی گئی۔ اسے کون جنگ کہنا پسند کرے گا؟

۷۔ ایک مرتبہ بعض قبائلیوں نے اچانک چراگاہ پر حملہ کر دیا تھا اور کچھ اونٹ ہنکالے گئے تھے۔ ان کا بھی

تعاقب کیا گیا اور اونٹ واپس لے لیئے گئے، یہ بھی جنگ نہ تھی۔

## جانی نقصان

سیرت نگاروں نے ان تمام مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دے لیا اور اس طرح تعداد خاصی بڑھ گئی حالانکہ ان میں سے ایک بھی مہم ایسی نہ تھی جسے جنگ کہا جاسکے۔ بلاشبہ بعض مہمیں ایسی ہیں کہ اطلاع ملی، فلاں مقام پر لوگ اس غرض سے جمع ہو رہے ہیں کہ مدینہ منورہ پر حملہ کر کے اول لوٹ مار کا شوق پورا کریں دوم قریش مکہ کی نظروں میں اعتبار پائیں، جو ہر اس گروہ کو سر پر بٹھانے کے لیے تیار رہتے تھے' جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے، ایسے بعض گروہوں کے خلاف اچانک اقدام کر کے انھیں منتشر کر دیا گیا۔ ایسی مہموں میں مسلمانوں کو بھی جانی نقصان پہنچا اور غیر مسلموں کے آدمی بھی قتل ہوئے۔ غرض میں نے قاضی سلیمان مرحوم کی درج کی ہوئی فہرست میں سے کم و بیش ستر مہمیں الگ کر لیں، جنہیں کسی بھی اعتبار سے جنگ نہیں کہا جاسکتا اور ان کے جانی نقصان کے اعداد بھی قاضی صاحب مرحوم ہی کی فہرست کے مطابق جمع کیے تو نتیجہ یہ نکلا:

| فریق | نقصان جان |
|---|---|
| مسلمان | ۹۶ |
| مخالفین | ۱۸۸ |

بعض مہموں میں مخالفوں کے مقتولوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی اور قاضی صاحب مرحوم بھی انکا کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ وہ اعداد قیاساً شامل کر لینے چاہئیں تاہم وہ پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ ان اعداد میں بنو قریظہ کے ان افراد کا جانی نقصان شامل نہیں، جنھیں سعد رضی اللہ عنہ بن معاذ کے فیصلہ ثالثی کی بنا پر موت کی سزا دی گی تھی، یہ سزا موسوی شریعت کے عین مطابق تھی اور سعد رضی اللہ عنہ کو بنو قریظہ نے خود ثالث بنایا تھا۔ ان مقتولین میں ایک عورت بھی تھی، جسے اس لیے سزائے موت ملی کہ اس نے قلعے کی چھت پر سے ایک مسلمان پر چکی کا پاٹ گرا کر شہید کر دیا تھا، حالانکہ وہ دیوار کے سایے صرف ستانے کے لے بیٹھ گیا تھا۔ یہ لوگ میدان جنگ کے مقتولین نہ تھے۔ اسی طرح رجیع اور بئر معونہ کے مسلمان شہدا بھی مسلمانوں کے جانی نقصان میں شامل نہیں ۔

## باقاعدہ جنگیں

جن مہموں کو باقاعدہ جنگیں قرار دیا جاسکتا ہے، وہ بھی مسلمانوں کو بالکل ناخواستہ پیش آگئی تھیں اور ان میں بھی پیش دستی مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ مثلاً

۱۔ غزوہ بدر یوں پیش آگیا: رسول اللہ ﷺ یہ اطلاع پاکر مدینہ منورہ سے نکلے کہ قریش کا وہ قافلہ تجارت شام سے لوٹ رہا ہے، جس کا پورا نفع مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری میں صرف ہونیوالا تھا' اس قافلے کو روکنا ضروری تھا۔ لیکن سالار قافلہ مختلف اطلاعات کی بنا پر پہلے ہی عام راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے نکل گیا' جو دس بارہ میل مغربی جانب تھا۔ اس اثنا میں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ قریش ایک ہزار کے قریب سواروں اور پیادوں کے ساتھ بدر پہنچ گئے ہیں' نیز ان کا ارادہ وہاں ٹھہرنے اور جشن منانے کا ہے۔ مسلمانوں کے لیے لڑنا اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ اگر طرح دبے جاتے تو اول قریش ان قبیلوں پر دباؤ ڈالتے، جن سے مسلمانوں کے معاہدے ہو چکے تھے اور ان قبیلوں کے لیے دوبارہ مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کی کیا صورت رہتی؟ دوم قریش مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دیتے تو نتائج مسلمانوں کے لیے بدر جہا زیادہ خطرناک ہوتے، جتنے بدر میں لڑنے سے ہو سکتے تھے۔ لہٰذا بدر کو مشیت ایزدی نے حق و باطل کی جنگ کا پہلا میدان بنا دیا۔

۲۔ غزوہ احد اس لیے پیش آیا کہ قریش مکہ نے بدر کے انتقام میں مدینہ منورہ پر حملہ کیا تھا۔ قریش مکہ کی فوج کم از کم تین ہزار تھی۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات سو تھے۔ تیر اندازوں کے ایک گروہ کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا سخت نقصان ہوا تاہم میدان انہی کے ہاتھ رہا۔

۳۔ غزوہ احزاب بھی قریش مکہ اور یہود خیبر کی مشترکہ سازش کا نتیجہ تھا، جس میں قریش و یہود مختلف قبائل کو گوناگوں لالچ دے کر ساتھ لے آئے اور کم از کم دس ہزار افراد نے مدینہ منورہ پر ہجوم کیا اور دفاع کے لیے ایک طویل خندق کھودی گئی۔

۴۔ غزوہ خیبر اس وجہ سے پیش آیا کہ یہود خیبر نے احزاب میں ناکامی کے بعد غطفان اور دوسرے قبائل کو مدینہ منورہ پر؛ حملے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ اقدام کر کے فتنے کی یہ آگ ہمیشہ کے لیے بجھا دی جائے۔

۵۔ موتہ کی مہم اس سبب سے پیش آئی کہ موتہ کے مسیحی حاکم شرجیل نے رسول اللہ ﷺ کے سفیر کو ناحق قتل کرا دیا تھا۔ سفیر کا قتل اس دور میں بھی ایک قبیح بین الاقوامی جرم تھا۔ تین ہزار مجاہدین اس خون ناحق کا انتقام لینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے کم از کم ایک لاکھ فوج غنیم کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

۶۔ مکہ مکرمہ پر یورش اس وجہ سے ناگزیر ہو گئی کہ قریش نے معاہدہ حدیبیہ کے باجود اپنے ایک حلیف قبیلے کو شہ اور مدد دے کر مسلمانوں کے قبیلے پر حملہ کرایا۔ رسول اللہ ﷺ نے تلافی مافات کی دو صورتیں پیش کر دیں۔ یعنی یا تو ان لوگوں کا خون بہا دیا جائے جو حملے کے باعث ناحق مارے گئے۔ یا قریش اپنے حلیف قبیلے کی پاسداری سے خود ہاتھ اٹھالیں۔ مسلمان بطور خود مناسب فیصلہ کر لیں

گے۔ قریش نے دونوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل نہ کیا اور مکہ مکرمہ پر پیش قدمی کے سوا چارہ نہ رہا۔

۷۔ غزوہ حنین اس وجہ سے پیش آیا کہ فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن اور بنو ثقیف مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے اور اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ حدود حرم میدان جنگ بنیں گے۔ محاصرہ طائف غزوہ حنین ہی کا شاخسانہ تھا۔

۸۔ تبوک کا سفر اس لیے اختیار کیا گیا کہ قیصر کی طرف سے عرب پر حملے کی تیاریوں کے متعلق متواتر خبریں موصول ہوئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ تیس ہزار جانبازوں کی معیت میں کٹھن منزلیں طے کر کے عرب کی شمالی سرحد پر پہنچ گئے تا کہ لڑائی غنیم کے علاقے میں ہو، بیس روز قیام فرمایا۔ کوئی لڑائی پیش نہ آئی اور حضور ﷺ مختلف گروہوں کو امان نامے دے کر لوٹ آئے۔

## با قاعدہ جنگوں کے نقصانات

ان با قاعدہ جنگوں کے جانی نقصانات کا اندازہ قاضی محمد سلیمان مرحوم کے فراہم کردہ اعداد کے مطابق درج ذیل ہے:[1]

| جنگ | مسلمانوں کا جانی نقصان | مخالفوں کا جانی نقصان | کیفیت |
|---|---|---|---|
| بدر | ۲۲ | ۷۰ | عام روایتوں کے مطابق صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ |
| اُحد | ۷۰ | ۳۰ | عام روایت کے مطابق قریش کے صرف ۲۳ افراد قتل ہوئے تھے۔ |
| خندق یا احزاب | ۶ | ۱۰ | عام روایت کے مطابق مخالفوں کے صرف چار آدمی قتل ہوئے تھے۔ |
| خیبر | ۱۸ | ۹۳ | |
| موتہ | ۱۲ | نامعلوم | |
| حنین | ۶ | ۷۱ | ابن حزم نے شہدائے حنین کی تعداد چار بتائی ہے۔ (جوامع السیرۃ ص ۲۴۱) |

[1] اس نقشے میں فتح مکہ کے نقصانات شامل نہیں وہ سابقہ اعداد میں شامل کر لیے گئے ہیں یعنی دو مسلمان اور گیارہ غیر مسلم۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| محاصرۂ طائف | ۱۳ | نامعلوم | |
| تبوک | x | x | |
| میزان | ۱۴۷ | ۲۷۴ | |

مخالفین کے جانی نقصان میں موتہ اور طائف کے اعداد شامل نہیں، وہ بہت زیادہ نہ ہوں گے۔

غرض تمام چھوٹی بڑی مہموں اور با قاعدہ جنگوں میں مسلمانوں اور مخالفوں کا کل جانی نقصان یہ ہوا:

مسلمان= ۶ +۱۴۷ ۹ =۲۴۳

مخالفین=۱۸۸+ ۲۷۴=۴۶۲

ان میں رجیع اور بئر معونہ کے شہدا کو شامل نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ تبلیغ کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے بھیجے ہی نہیں گئے تھے اگر آپ انہیں بھی جانی نقصان میں شامل کرلیں تو پوری تعداد اناسی کے اضافے سے تین سو بتیس بن جائے گی۔ اسی طرح مخالفوں کے اعداد نقصان میں جنگ، موتہ اور محاصرہ طائف کے مقتولیں شال نہیں کیے گئے۔ ان کے شمول سے مخالفوں کی تعداد میں بھی کسی قدر اضافہ ہو جائے گا اگرچہ وہ زیادہ سے زیادہ چند سو ہی کا ہو سکتا ہے۔

## قاضی صاحب مرحوم کا نقشہ

قاضی محمد سلیمان مرحوم نے پہلے غزوات وسرایا کا ایک مفصل نقشہ دیا ہے، جس میں ایک ایک مہم اور ایک ایک جنگ کے متعلق الگ الگ بتایا گیا ہے کہ فریقین کے کل کتنے آدمی شریک تھے اور ان میں سے کتنے مقتول یا شہید، کتنے مجروح اور کتنے اسیر ہوئے۔ [1] پھر انھوں نے تمام اعداد کا ایک جامع نقشہ تیار کیا جو درج ذیل ہے [2]:

| فریق | شہید یا مقتول | مجروح | اسیر | میزان | کیفیت |
|---|---|---|---|---|---|
| مسلمان | ۲۵۹ | ۱۲۷ | ۱ | ۳۸۷ | قاضی صاحب مرحوم نے تصریح فرمادی کہ فریقین کے زخمیوں کی تعداد صحیح نہیں، اسیروں اور مقتولوں کی تعداد صحیح ہوگی۔ انشاء اللہ |

[1] رحمۃ اللعالمین جلد دوم (ص ۲۴۴، ۲۶۴)

[2] ایضاً ایضاً (ص ۲۸۰)

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| مخالفین | ۷۵۹ | ـ | ۶۵۶۴ | ۷۳۲۳ | = |
| میزان | ۱۰۱۸ | ۱۲۷ | ۶۵۶۵ | ۷۷۱۰ | = |

## توجہ طلب حقیقت

خاص توجہ کی محتاج یہ حقیقت ہے کہ رمضان ۱ھ (مارچ ۶۲۳ء) سے ۹ھ (۶۳۰) تک جتنی جھڑپیں، یا کشمکشیں یا جنگیں ہوئیں، ان میں مسلمانوں اور مخالفوں کا نقصان جانی زیادہ سے زیادہ ایک ہزار اٹھارہ نکلتا ہے اور یہ اتنا بے حقیقت نقصان ہے کہ جب میں نے مختلف احباب سے اس کا ذکر کیا تو انھیں ابتدا میں یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ عرض کیا جارہا ہے، وہ حقیقت ہے۔ اچھا، آپ فرض کرلیں کہ یہ نقصان حقیقی کا صحیح مرقع نہیں۔ اس عدد کو دگنا یا تگنا کر لیجیے۔ پھر بھی نقصان زیادہ سے زیادہ تین ہزار جانوں کا ماننا ہوگا۔ یاد رہے کہ اس حساب میں ہم نے غزوات و سرایا کی نوعیتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہر جھڑپ کے نتائج یکجا کرلیے ہیں، انھیں آٹھ سال پر پھیلا لیا جائے تو فی سال کے حساب سے پونے چار سو آدمیوں کا نقصان ہوا اور یہ ان جنگوں کا نقصان ہے جن کے نہ رسول اللہ ﷺ خواہاں تھے اور نہ حضور نے کسی میں پیش دستی کی۔ معاملہ محض پیغام حق کی تبلیغ کا تھا، جو صلح و امن کے ساتھ رزم و پیکار سے قطع نظر کرتے ہوئے برابر جاری رہا۔ کس طرح اور کیونکر؟ اس کے مفصل حالات ہمیں معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال عرب کی اندرونی کشمکشیں ختم ہوگئیں اور تبلیغ نے پہلی منزل کامیابی سے طے کرلی، یعنی عرب جوق در جوق، گروہ در گروہ اور قبیلہ در قبیلہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، جو وجود اقدس حق و باطل کی پہلی امتحان گاہ یعنی غزوہ بدر میں صرف تین سو تیرہ جانباز لا سکا تھا، وہ تبوک کی جانب روانہ ہوا تو اس کا پرچم حق تیس ہزار سرفروشوں پر لہرا رہا تھا۔ اللہ اور دین حق کی راہ میں سب کچھ نثار کر دینے والا اتنا بڑا لشکر پہلے عرب کی سرزمین سے اٹھا تھا۔

کیا حقیقتہً ہزار سوا ہزار یا زیادہ سے تین ہزار جانوں کے نقصان کے ساتھ اتنا عظیم القدر کارنامہ انجام دینے کی کوئی مثال روئے زمین کی سرگزشت کے کسی بھی حصے سے پیش کی جاسکتی ہے؟ اس سر گزشت میں ظہور اسلام سے پیشتر کا دور بھی شامل ہے اور بعد کا دور بھی، پھر یہ روشن حقیقت بھی ہر لحاظ سے سامنے رہنی چاہیے کہ یہ صرف زمین کی تسخیر نہ تھی، یہ تخت حکومت اور سریر سلطنت آراستہ کرنے کا معاملہ نہ تھا۔ اس دور میں ایک نئی قوم وجود پذیر ہوچکی تھی۔ کیسی قوم؟ قرآن مجید گواہ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران:۱۱۰)

"مسلمانو! تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو عالم انسانیت کے ارشاد و اصلاح کے لیے ظہور میں آئی۔ تم نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔"

ان تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں سب کچھ فرمادیا گیا، جو کسی انسانی گروہ کی مدح وستایش میں کہا جاسکتا تھا۔ اللہ پر ایمان، معروف کا حکم اور منکر کی روک تھام کے بعد کون سی چیز باقی رہ گئی، خواہ اس کا دائرہ کوئی ہو؟

پھر عربوں کی حالت ظہور اسلام سے پیشتر کیا تھی؟ جنگل کے وحشیوں اور درندوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تمام قبیلوں اور گروہوں کے چلن وحشیانہ تھے۔ لوٹ مار کے سوا ان کا کوئی پیشہ نہ تھا۔ ان کی زندگیاں فتنہ وفساد میں کٹتی تھیں۔ دو شخصوں میں معمولی سی بات پر جھگڑا ہو جاتا تو قبیلوں کے قبیلے اس آگ میں کود پڑتے تھے۔

قرآن مجید ہی گواہ ہے کہ اس قوم کو جو شیوہ ہائے انسانیت کے اعتبار سے شاید رُوئے زمین کی پست ترین قوم تھی، بلند ترین مسند پر لا بٹھایا اور امامت روئے زمین کا منصب سونپ دیا:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (آل عمران:۱۰۳)

”اللہ نے تمھیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو تمہارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ (لیکن اللہ کے فضل وکرم سے ایسا ہُوا کہ) بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا حال تو یہ تھا کہ آگ سے بھری خندق کے کنارے کھڑے تھے (ذرا پاؤں پھسلتا اور شعلوں میں جا گرتے) اللہ نے تمھیں اس خطرناک حالت سے نکال لیا۔“

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ (انفال: ۶۳)

”اور (اللہ ہی ہے جس نے) مومنوں کے دلوں میں باہم اُلفت پیدا کر دی، اگر تو وہ سب کچھ صرف کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے۔ جب بھی ان کے دلوں میں باہمی الفت نہ جوڑ سکتا یہ اللہ ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔“

اسی مختصر سی مدت میں جس میں تسخیر ارض کی پہلی منزل طے ہُوئی، نئی قوم معرض وجود میں آگئی۔ ایک نیا نظام بھی پوری کامیابی سے جاری ہو گیا جو روئے زمین کے انسانوں کی تقدیریں پلٹ دینے والا تھا اور کیسی قوم؟

اگر تاریخ میں ایسی دوسری قوم کی مثال ملتی ہے تو تلاش کر لیجیے۔ اتنے معمولی سے جانی نقصان کی بناء پر جس کی حقیقی مقدور سوا ہزار سے زیادہ نہ تھی، صرف آٹھ نو سال میں یہ سب کچھ عملی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا۔ کیا اس وجود اقدس کے ”رحمتہ للعٰلمین“ ہونے میں کسی کو دم بھر کے لیے تامل ہو سکتا ہے؟ لوگ معجزوں میں کلام کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ پُر تاثیر اور یقینی طور پر ناقابل انکار معجزہ کون سا

ہو سکتا ہے؟

## تصویر کا دوسرا رُخ

یہاں تقابل مقصود نہیں، کیونکہ تقابل بہ ہر حال کسی نہ کسی مناسبت کی بناء پر کیا جاسکتا ہے اور یہاں مناسبت کا ملأ ناپید ہے۔ ہاں، عبرت کی غرض سے کچھ اعداد و شمار ان قوموں اور ملکوں کے پیش کیے جاتے ہیں، جو بہ زعم خویش تہذیب و شائستگی کے سدرۃ المنتہٰی پر بیٹھے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے ابتدائی دور میں انگریزوں کو اپنی اور فرانسیسیوں کی فوجیں ڈنکرک سے نکالنی پڑی تھیں تو آدمیوں کو بچالانا مقدم قرار دے دیا گیا اور بھاری سامان جنگ دشمن کے حوالے کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ چرچل نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ سازوسامان جنگ مشینوں میں ڈھالا جا سکتا ہے لیکن آدمی مشینوں میں نہیں ڈھالے جاسکتے۔ تاہم آپ خوب چھان بین کرلیں کہ مہذب یورپ نے باہمی جنگوں میں اور خصوصیت سے ان جنگوں؛ میں جو ایشیائی اور افریقی خطوں میں کی گئیں، انسانی خون کو پانی سے بڑھ کر ارزاں بنائے رکھا یا نہیں اور یہ سلسلہ مشرق وسطیٰ یا ہند چینی میں آج بھی انتہائی بے پروائی سے جاری ہے۔ گویا وہاں انسان نہیں بستے جن کے خون کا احترام اہل مغرب میں سے کسی کے لیے قابل توجہ ہو۔

## مرقع عبرت

آپ نے رحمۃ للعٰلمین ﷺ کی ناخواستہ جنگوں کے اعداد ملاحظہ فرمالیے، جنھیں زیادہ سے زیادہ بڑھا کر بھی آٹھ نو سال میں تین ہزار تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اب داعیان تہذیب کی رزم آرائیوں کا پورا مرقع نہیں، بلکہ اس کی صرف چند جھلکیاں دیکھ لیجیے۔

۱۔ ”سی سالہ جنگ“ ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک تیس سال جاری رہی، جس میں جرمنی، فرانس، آسٹریا، سویڈن وغیرہ نے حصہ لیا۔ اس میں صرف جرمنی کے ایک کروڑ بیس لاکھ آدمی مارے گئے۔ [1]

۲۔ امریکی خانہ جنگی ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک جاری رہی۔ اس میں ایک فریق شمالی ریاستیں اور دوسرا فریق جنوبی ریاستیں تھیں اور جنگ کا سبب غلامی کا مسئلہ تھا۔ اس میں تین لاکھ آدمی شمالی ریاستوں کے اور پانچ لاکھ جنوبی ریاستوں کے مارے گئے۔ چوہتر کروڑ پونڈ خرچ ہُوئے۔ اس رقم سے دنیا بھر کے غلام ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آزاد کرائے جاسکتے تھے۔ امریکہ میں غلامی قانوناً ختم ہو چکی

[1] Book of Facts ص ۶۱۴

ہے۔ لیکن اس کی تمام لعنتیں آج بھی وہاں مکروہ ترین صورت میں موجود ہیں۔

۳۔ پہلی عالمی جنگ میں ایک کروڑ آدمی مارے گئے تھے اور دو کروڑ مجروح ہوئے تھے۔ خدا جانے؛ ان میں سے کتنے لُولے، لنگڑے، اندھے اور اپاہج ہوئے اور کتنوں نے ہسپتالوں میں جانیں دیں۔ پھر اس جنگ ہی سے انفلوئنزا شروع ہُوا، جس میں مزید ایک کروڑ آدمی مر گئے۔ ایک انسانیت دوست صاحب علم کا اندازہ ہے کہ اس جنگ پر اسی (۸۰) ارب پونڈ خرچ ہُوئے۔ اس رقم سے فرانس اور بلجیم کی نہ صرف زمین بلکہ ہر چیز پانچ پانچ مرتبہ خریدی جا سکتی تھی۔

## دوسری عالمی جنگ

۴۔ دوسری عالمی جنگ کے صرف مقتولین کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے:

| | |
|---|---|
| چین | ۱۳،۱۰،۲۲۴ |
| فرانس | ۲،۰۰،۰۰۰ |
| جرمنی | ۶۳،۰۰۰،۰۰ |
| صرف فضائی بمباری | ۵،۰۰،۰۰۰ |
| جاپان | ۵،۳۵،۷۹۵ |
| بمباری سے | ۴۱،۲،۳۰۹ |
| یونان | ۴،۱۵،۰۰۰ |
| برطانیہ | ۳،۵۳،۶۵۲ |

ان اعداد کی میزان قریباً ایک کروڑ بنتی ہے لیکن ان میں بہت سے شرکائے جنگ کے مقتولین شامل نہیں۔ مثلاً چیکوسلواکیا، پولینڈ، روس، فن لینڈ، یوگوسلاویا، بلغاریا، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ، پھر مختلف ملکوں کے ان گروہوں کا جانی نقصان معلوم نہ ہو سکا، جنہیں ہٹلر کی فوجیں جبری مزدوری کے لیے جرمنی لے گئی تھیں۔ اور جنگ کے اختتام تک وہ لوگ واپس نہ ہو سکے۔ یہ تمام اعداد جمع کیے جائیں تو دوسری عالمی جنگ کا نقصان دو کروڑ افراد سے بھی بڑھ جائے گا۔

آتش ریز اور آتش خیز بموں سے شہر، قصبے، کارخانے، کھیتیاں، زمینیں، گاؤں، بندرگاہیں، بجلی اور پانی کے مرکز جس طرح تباہ ہُوئے ان کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹمی بموں سے جو قیامت برپا ہُوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔

## ربانی سیاست اور شیطانی سیاست

رحمۃ للعلمین ﷺ ربانی سیاست پر کاربند تھے اور اسی سیاست کو اولاد آدم کا دائمی مسلک بنادینے کا پیغام پہنچا گئے۔ جو اعداد اوپر پیش ہو چکے ہیں، وہ ان گروہوں، جماعتوں اور قوموں کے کارنامے ہیں، جنھیں ربانی سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ان کا مدار شیطانی سیاست ہے۔ ربانی سیاست کا پورا نظام ربانی صفات کے مرکز پر گھوم رہا ہے۔ جس میں رحمت، شفقت، رافت کار فرما ہوتی ہیں۔ انسانوں کی مادی اور معنوی تربیت صحیح اصول پر کی جاتی ہے۔ شیطانی سیاست عالم انسانیت کے لیے شدید طوفان برق و باد یا نہایت خوفناک بھونچال کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے جزوی مظاہرے جابجا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تخریب در تخریب اور اعدام در اعدام کے سوا کچھ نہیں۔

سوچیے کہ اگر نوع بشر کے ہوش و حواس سلامت ہیں تو وہ کس سیاست کو اپنی بہتری اور بہبود کے لیے چنے گی؟ وہ سیاست جسے تھوڑی مہلت مل جائے تو روئے زمین کے بہترین خطوں کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے اور انسانوں کی عظیم صفوں کی مہلت حیات آگ اور خون کے طوفانوں میں ڈبو دے؟ انسانیت کی بہتری صرف ربانی سیاست ہے، جسے عرب کی چھوٹی جماعتیں لے کر نکلیں تو جہاں پہنچیں تاریکیوں میں اجالا کر دیا۔ صلح و امن اور محبت و مواخات کے سلسلے قائم کر دیے اور انسانوں میں جب باری تعالیٰ، حب رسول اللہ ﷺ اور حب انسانیت کی لگن پیدا کر دی۔ آج حضور رحمۃ للعلمین ﷺ کے کروڑوں نام لیوا موجود ہیں مگر کہیں کوئی ایسا منظر نہیں ملتا جو قلب و روح کے لیے وجہ اطمینان یا حضور ﷺ کی ذات بابرکات سے انتساب کے پیش نظر زیبا ہو:

نہ داغ تازہ مے کارد نہ زخم کہنہ مے خارد
بدہ یا رب دے کایں صورت بے جاں نمے خواہم

# عالمی اصلاح وامن کی محکم بنیادیں

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لایزال است و قدیم
نوع انساں را پیام آخریں حامل او رحمۃ للعلمین ﷺ

## عالمی اور بین الاقوامی زاویہ نگاہ

اسلام کا زاویہ نگاہ یک قلم عالمی اور بین الاقوامی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ پوری کائنات انسانیت کی ہدایت کے لیے معبوث ہوئے تھے اور حضور ﷺ نے جب تبلیغی دعوت نامے ارسال فرمائے تھے تو وہ صرف رُوسائے عرب کے لیے نہ تھے بلکہ ایران کے کسریٰ، مشرقی روم کے قیصر، مصر کے مقوقس اور حبش کے نجاشی کے لئے بھی تھے۔ یہ ملک عرب کے اردگرد واقع تھے، ان کے ساتھ عربوں کے تجارتی روابط تھے اور وہ ان ملکوں میں جاتے آتے تھے۔ یہ عالمی دعوت اسلام کی طرف پہلا قدم تھا۔ مسلمانوں کا فرض تھا کہ حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں دعوت و تبلیغ کے دائرے کو تدریجاً وسیع تر کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ اسلام دنیا بھر میں پھیل جاتا اور رسول اللہ ﷺ جس غرض سے معبوث ہوئے تھے۔ وہ پایہ تکمیل پر پہنچ جاتی۔ افسوس کہ تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد ایسی حکومتیں وجود میں آگئیں، جو وضع و ہیئت ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ بڑی حد تک معنوی اعتبار سے بھی ویسی ہی بادشاہیاں تھیں، جیسی ظہور اسلام سے پیشتر موجود تھیں۔ کہیں کوئی اچھا فرمانروا بروئے کار آتا رہا تو اس نے اپنے ماحول کے اعتبار سے مربیانہ سیاست کے مطابق کام کیا لیکن فی الجملہ حالت بگڑتی گئی، یہاں تک کہ وہ بادشاہیاں بھی رفتہ رفتہ اسی حالت کو پہنچ گئیں، جو ان کے لیے مقدر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی البتہ بعض نیک اور سعید ہستیوں نے جابجا تربیتی اور تبلیغی مرکز قائم کیے، جن کی برکات وحسنات کے ذکر کا یہ محل نہیں۔

یہاں قرآن مجید کے چند انقلاب انگیز اصول پیش کیے جاتے ہیں، جو عالمی صلح وامن اور خیر و بہبود

کے زبردست عوامل تھے۔ تعجب ہے کہ خود مسلمان بھی ان پر ٹھیک عمل پیرا نہ ہو سکے۔ اس حالت میں دوسروں سے عمل پیرائی کی کیا امید رکھی جا سکتی تھی۔

## بین الاقوامی امن کے تقاضے

بین الاقوامی اصلاح و امن کے سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی امر یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانی گروہوں، جماعتوں اور قوموں کو اصولی اعتبار سے مساوی تسلیم کیا جائے اور اس مساوات کو عملی لباس پہنانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی جائے۔ اگرچہ کسی کا عقیدہ کچھ ہو جو کتاب رحمۃ للعٰلمین ﷺ پر نازل ہوئی، اس میں انسانی مساوات کا غیر مشتبہ اعلان موجود ہے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝۱۳ (حجرات: ۱۳)

"لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم پہچان لیے جاؤ۔ یقیناً تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہے۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔"

تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں۔ جس طرح ایک ماں باپ کے بچوں میں فرق و امتیاز کی کوئی وجہ نہیں، اسی طرح تم کیوں امتیازات قائم کرتے ہو؟ وہ بھی ایسے جن کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں مثلاً رنگ اور نسل کا اختلاف، دولت و حشمت کا اختلاف، مختلف جغرافیائی خطوں کا اختلاف، یہ تمام اختلافات سراسر باطل اور بے اصل ہیں، جن میں الجھ کر تم ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی کرتے ہو، حالانکہ تمہیں چاہیے ان سے قطع نظر کرتے ہوئے بنیادی یکسانی اور یکجہتی کو مرکز توجہ بناؤ یعنی تم سب انسان ہو۔

حضور ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حرم پاک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا ان میں مخاطب وہ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اکیس برس تک ظلم و تعدی کا کوئی بڑے سے بڑا طوفان بپا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور شاید ہی کوئی ایسا چہرا ہو، جو مخاطبین کی برچھیوں، تلواروں اور تیروں سے جراحت زار نہیں بن چکا تھا۔ تاہم حضور ﷺ نے فرمایا آج تم پر کوئی الزام نہیں اور تم سب آزاد ہو۔

نیز فرمایا: اے قریش! جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدمؑ کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ پھر سورہ حجرات کی یہی چودھویں آیت تلاوت فرمائی جو اوپر منقول ہے۔ اس سے مزید توثیق ہو گئی کہ یہ آیت مساوات انسانی کی بنیاد ہے۔

واضح رہے کہ اسے وقتاً فوقتاً پڑھ دینا کافی نہیں، اس پر اسی طرح عمل ہونا چاہیے، جس سے

مطلوب مساوات کی تکمیل ہو۔ تمام قوموں اور گروہوں کے درمیان ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے رشتے استوار ہوتے جائیں۔ امن عالم ایک حقیقت ثابتہ کی شکل اختیار کرلے۔ ایسا ہی ماحول پیغام حق کی اشاعت کے لیے بہ حیثیت مجموعی سازگار ہو گا۔ توپوں کے آتشیں گولوں یا طیاروں کی تباہی خیز بمباریوں کو پیغام پہچانے اور حضور ﷺ کے منصب اصلاح انسانیت کو لباس عمل پہنانے کا اچھا ذریعہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

## اکثریت کی بنیاد

پھر دیکھیے، اس آیہ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسانوں کی عزت واکرمیت کی بنیاد دولت، رنگ، خون، نسل، قوم یا کوئی خاص جغرافیائی خطہ نہیں صرف تقویٰ اور حسن عمل ہے۔ ہر انسان اس بنا پر عزت کا مستحق نہیں سمجھا جاسکتا کہ کروڑ پتی یا ارب پتی ہے، اس کا رنگ گورا ہے، اس کا تعلق آریائی نسل سے ہے جیسا کہ روئے زمین کے بعض فاتر العقل گروہ سمجھ رہے ہیں اور ان میں چھوت چھات کوئی نہ کوئی شدید افتراق انگیز شکل اختیار کیے ہوئے موجود ہے۔ صرف نیک عملی انسانی اکرمیت کی اساس ہے۔ اس باب میں سکندروں اور نپولینوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ موجدوں، فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور خطیبوں کو ان کے محض پیشوں اور مشغولیتوں کے اعتبار سے بھی لایق توجہ نہیں سمجھا جاتا۔ وہاں محض نکوکاری، راست بازی، حق پرستی اور خلق دوستی درکار ہے۔ اس کے سوا ہر سکۂ عمل کھوٹا اور ہر سرگرمی کار بے حقیقت ہے۔

اس کی حقیقت پر آپ نے غور فرمایا؟ اس دنیا میں حسن عمل کے سوا ہر معیار عظمت حسد، رقابت اور کشمکش کا موجب ہوتا ہے۔ دولت کو معیار بنایا جائے تو جسے جائز ذریعے سے حاصل نہ ہو گی، وہ ہر ناجائز ذریعے سے حاصل کرے گا اور خلق خدا کے لیے لعنت بن جائے گا۔ فن حسب وسیاست میں کمال کو معیار بنایا جائے گا تو مختلف لوگ روئے زمین کو انسانوں کے خون سے رنگنے میں اپنی زندگیاں تمام کردیں گے اور دنیا ان کو صرف نفرین کا مستوجب ٹھہرائے گی لیکن حسن عمل میں رقابت یا حسد راہ ہی نہیں پاسکتے کیونکہ وہ منافی حُسنِ عمل ہوں گے۔ یوں تمام انسانوں کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ حسنِ عمل کی فراوانی سے روئے زمین امن وسلامتی کا بہشت زار بن جائے۔

## دین میں کوئی جبر نہیں

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ

الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ:۲۵۶)

"دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں۔ بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کر دے (یعنی سرکشی، فساد اور گمراہی سے یک قلم بیزار ہو جائے) اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کی مضبوط ٹہنی پکڑ لی جو ٹوٹنے والی نہیں (جس کے ہاتھ آ گئی وہ گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔"

انسانی ظلم و ستم کے جو خونچکاں واقعات تاریخ کے صفحات پر منقوش ہیں، ان میں سے تین چوتھائی واقعات صرف جبر و تشدد کا نتیجہ ہیں، جو ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے بے دریغ روا رکھے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہر سلیم العقل انسان پر، روز روشن کی طرح آشکارا تھی کہ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جبر و استکراہ سے انسانی جسم کو اپنی مرضی کے مطابق جھکایا جا سکتا ہے، مگر دل میں اعتقاد و ایمان کا چراغ روشن نہیں کیا جا سکتا اور جب تک چراغ یقین روشن نہ ہو گا، وہ اعمال ظہور پذیر نہیں ہو سکتے، جو ازروئے دین مطلوب و منظور ہیں بلکہ جبر سے دلوں میں نفرت و کراہت کی آگ مشتعل ہو گی اور جب جابر قوت میں ضعف آئے گا تو رد عمل کو کوئی طاقت روک نہ سکے گی اور وہی صورت حال نمودار ہو جائے گی جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے:

كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (نحل:۹۲)

"اس عورت کی مثال، جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن کے فوائد میں اس آیت کے متعلق لکھا گیا ہے:

جب دلائل توحید بخوبی بیان فرما دی گئیں، جس سے کافر کا کوئی عذر باقی نہ رہا تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے؟ عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے۔ نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ۔ [1]

پھر اس آیت کے مطالب کی توثیق بعض دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۗ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس:۹۹)

"اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں، وہ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ میں چھوڑنے والا نہیں؟"

اس آیۂ مبارکہ سے ایک طرف یہ نمایاں ہے کہ مخلوق کی ہدایت کے لیے رسول اللہ کے قلب مبارک کی تڑپ کا کیا عالم تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ اس معاملے میں جبر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ

---

[1] قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ص ۵۴ حاشیہ

کی مشیت یہی ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں خود سوچ سمجھ کر اس طرف متوجہ ہوں اور بقدر استعداد سعادت کی منزلیں طے کریں۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

آپ کو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں۔ خدا چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا' مگر ایسا کرنا اس کی تکوینی حکمت و مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لیے نہیں کیا گیا۔ [1]

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۔ (کہف:۲۶)

"(اے پیغمبر) کہہ دو، یہ سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے اب جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں چاروں طرف سے انھیں گھیر لیں گی۔"

غرض جس طرح مساوات کا اعلان شرف انسانی کے اعتراف کا ایک جزو ہے، اسی طرح عقیدہ و ایمان کے سلسلے میں جبر کی نفی بھی انسانی شرف ہی کا ذریعہ ہے، لیکن اسلام ہر انسان میں جہاں اشرفیت کا زیادہ سے زیادہ گہرا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، وہاں یہ توقع بھی رکھتا ہے (اور رکھنی چاہیے) کہ انسان اپنے شرف ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسن عمل کا مصدر بنیں گے اور خدا پر ان کا ایمان زیادہ سے زیادہ مستحکم و استوار ہو گا کیونکہ اشرفیت کا احساس سلیم العقل انسان کو کسی اور طرف لے جا ہی نہیں سکتا۔

## عدل پر استواری

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸ (مائدہ:۸)

"اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کو مضبوطی سے کھڑے ہو جایا کرو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ اس سے انصاف نہ کرو۔ (ہر حال میں) انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو اللہ کو خوب خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔"

حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن میں ہے کہ قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ میں حقوق اللہ کی طرف اور

---

[1] قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ۲۴۸۔۲۸۵ حاشیہ

"شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ" میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے:

"عدل" کا مطلب ہے کسی کے ساتھ بدونِ افراط و تفریط وہ معاملہ کرنا، جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلے کو جھکا نہ سکے معلوم ہوتا ہے کہ "عدل و قسط" یعنی دوست دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملے میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا، یہ فضیلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین انصاف میں سے ہے۔ [1]

ہر سلیم العقل انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ اسلام کن خصوصیات والے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کسی فرد یا جماعت سے کتنی ہی عمیق محبت یا کتنی ہی شدید دشمنی ہو۔ جب گواہی دینے کا مرحلہ سامنے آئے گا، مسلمان کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے گا، جو حق و انصاف کے عین مطابق نہ ہو۔

یاد ہو گا کہ فتح خیبر کے بعد وہاں کی زمین نصف پیداوار کی بنا پر یہودیوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ کو بٹائی کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ وہ پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دو انبار لگوا دیتے اور یہودیوں سے کہتے کہ جو حصہ چاہو، اٹھالو۔ یہودی کہتے: "زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔" مسلمانوں کا وظیفۂ حیات روئے زمین پر یہی تھا اور ایسے ہی اصول حیات عالمی امن کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ وہ افراد یا گروہ اس وظیفے کی بجا آوری سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، جن کی زبانوں سے الفاظ نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، پھول جھڑ رہے ہیں لیکن ان کے دل، ان کی طبیعتیں اور ان کی ذہنیتیں نہایت پست اور امن بر انداز اغراض سے یک قلم آلودہ ہیں۔ یہ وہی شیوہ ہے جس پر مدینہ منورہ کے یہودی عربوں کے تعلق میں کاربند تھے اور کہا کرتے تھے:

لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ (آل عمران:۷۵)

"امیوں (یعنی عربوں) کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ہم پر کچھ مواخذہ نہیں (یعنی ان کے ساتھ دیانت داری برتنا ضروری نہیں) اور یہ کہہ کر وہ اللہ پر تہمت باندھتے ہیں حالانکہ اچھی طرح جانتے ہیں حقیقت حال کیا ہے؟"

یعنی جس گروہ سے ذاتی اغراض وابستہ ہیں، ان کے متعلق ایک نظام اخلاق اور ایک ضابطہ نیک و بد ہے لیکن جن سے کوئی خاص علاقہ نہیں، ان کے باب میں بالکل دوسری روش اور دوسرے اصول پیش کیے جاتے ہیں۔

## نیکی میں تعاون بدی سے گریز

---

[1] قرآن مجید مترجمہ، حضرت شیخ الہند ص ۱۴۰ حاشیہ

قرآن نے ایک انقلاب انگیز اصول مندرجہ ذیل آیت میں پیش کیا ہے۔

وَلَا یَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ۘ وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲﴾ (مائدہ:۲)

"جس گروہ نے تمھیں مسجد حرام سے روک دیا تھا، اس کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ ابھار دے کہ اس کے ساتھ زیادتی کرنے لگو (تمھارا دستور العمل تو یہ ہونا چاہیے کہ) نیکی اور پرہیز گاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گناہ اور ظلم کی کسی بات میں تعاون نہ کرو اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو۔ وہ (پاداش عمل میں) سخت عذاب دینے ولا ہے۔"

قریش مکہ نے حدیبیہ میں مسلمانوں کو ادائے عمرہ سے روک دیا تھا، جب اختیار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی تو انھیں پر یہ واضح کر دینا ضروری تھا کہ قریش کی سابقہ زیادتی تمھارے لیے زیادتی کا موجب نہ بن جائے۔ اگرچہ تمھارے خیال کے مطابق وہ ان کی زیادتی کا جواب ہی ہو۔ مسلمان کا دستور العمل یہ ہے کہ جہاں نیکی اور اچھائی دیکھتا ہے، اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ بر و تقویٰ زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں۔ البتہ ظلم و گناہ سے دور رہنا لازم ہے۔ انھیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہ دینا چاہیے۔

## انسان اور راستبازی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۳۵﴾ (نسا:۱۳۵)

"اے ایمان والو! تم انتہائی مضبوطی اور پختگی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے ہو جاؤ کہ اگر وہ گواہی خود تمھارے خلاف یا تمھارے ماں باپ اور قرابت داروں کے بھی خلاف ہو تو ہر گز نہ جھجکو۔ اگر کوئی مالدار یا مفلس ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان پر مہربانی رکھنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہوائے نفس کی پیروی تمھیں انصاف سے باز رکھے۔ اگر تم (گواہی دیتے وقت) بات کو گھما پھرا کر پیش کرو گے یا گواہی دینے سے پہلو بچا جاؤ گے تو (یاد رکھو) اللہ تمھارے کاموں سے پوری طرح آگاہ ہے۔"

انسان کے لیے ایک اہم مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں سچ پر قایم و استوار رہے اور سچی گواہی دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرے، اگرچہ سچ بولنے سے خود اسے یا اس کے والدین اور قرابت داروں کو نقصان پہنچے۔ یہ بھی ممکن ہے کسی کو مالدار کے مال کا لالچ یا اثر و رسوخ کا خوف سچ کہنے سے تمھیں باز رکھے یا

کوئی مفلس ہو جس کی مفلسی پر ترس کھا کر تھوڑی سی غلط بیانی گوارا کرلی جائے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی مالدار ہو یا غریب، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان کے لیے گواہی دینے والے سے کہیں زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوگی۔ غرض انصاف کے معاملے میں ہوائے نفس کی پیروی ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی نہیں کہ بیان میں ہیر پھیر کا طریقہ اختیار کیا جائے یا گواہی نہ دینے ہی سے گریز کو پناہ گاہ بنالیا جائے۔ اس طرح انسانوں کو چکما دیا جاسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ جو لوگ اپنے خلاف یا اپنے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے خلاف بھی سچ کہتے ہوئے نہ جھجکیں، وہ مخلوق کی بھلائی اور بہبود کے لیے جو گراں بہا کام انجام دے سکتے ہیں، ان کی توقع ایسے لوگوں سے کیونکر رکھی جاسکتی ہے جو ایک لفظ زبان سے نکالتے وقت دس مرتبہ سوچتے ہیں کہ اس سے ہمارے موافقوں پر توزد نہ پڑے گی اور ہمارے مخالف تو فائدہ نہ اٹھالیں گے اس کا نام ان کے ہاں "سیاستدانی" اور "تدبر" ہے۔ امن عالم کے ضامن وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو حق وانصاف کے معاملے میں راست بازی کے اس انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہوں۔

## برائی کے جواب میں بھلائی

قرآن مجید کا ایک انقلاب انگیز اصول یہ ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ (حم سجدہ:۳۴)

"اور نیکی اور بدی برابر نہیں۔ (بدی کو) اس طریق سے دور کر جو اچھا ہے (یعنی نیکی کے ذریعے سے) پھر تم دیکھو کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان دشمنی ہے وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے گا۔"

حضرت شیخ الہند مرحوم کے مترجمہ قرآن مجید کے فوائد میں ہے:

خوب سمجھ لو بدی نیکی اور نیکی بدی کے برابر نہیں ہوسکتی، دونوں کی تاثیر جداگانہ ہے۔ بلکہ ایک نیکی دوسری نیکی سے اور ایک بدی دوسری بدی سے اثر میں بڑھ کر ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک مومن قانت خصوصاً ایک داعی الی اللہ کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دے بلکہ جہاں تک گنجائش ہو برائی کے مقابلے میں بھلائی سے پیش آئے۔ اگر کوئی اسے سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے مقابل وہ طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جو اس سے بہتر ہو اس طرز عمل کے مقابلے میں تم دیکھ لوگے سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا اور جو دل سے دوست نہ بنے تاہم ایک وقت آئے گا جب وہ ظاہر میں ایک گہرے اور گرم جوش دوست کی طرح تم سے برتاؤ کرنے لگے گا بلکہ ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد سچے دل سے دوست بن جائے۔

غرض یہ اصول ایسا ہے کہ ہر ہمتور اور مخلص انسان اس پر عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ پھر مسلمان تو

حقیقتہً ایک مستقل داعی الی اللہ ہے۔ مزید بر آں خود رسول اللہ ﷺ کا دستور یہی رہا اور حضور ﷺ کی پیروی سے بڑھ کر کسی کے لیے راہ سعادت کیا ہو سکتی ہے؟

## عدل و احسان

قرآن مجید کی ایک اور جامع انقلابی دعوت پر غور فرمایئے، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (نحل:۹۰)

”اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملے میں) انصاف کرو۔ (سب کے ساتھ) بھلائی سے پیش آؤ۔ قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو اور تمھیں روکتا ہے بے حیائی کی باتوں سے، ہر طرح کی برائیوں سے اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ (سمجھو) اور نصیحت پکڑو۔“

اللہ کا فرمان مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ عدل کو اپنا شیوہ بناؤ، نیک کرداری میں سرگرم رہو۔ قرابت والوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ فحش کاموں سے بچو، ہر طرح کی برائیوں سے اجتناب کرو۔ ظلم و زیادتی سے کبھی آلودہ نہ ہو۔

جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے، ان کے لیے اب آزمایش عقاید میں نہ تھی، اعمال میں تھی۔ اس لیے اس آیت میں عملی زندگی کی تمام مہمات بیان کر دیں اسی لیے مفسرین نے اسے جوامع آیات میں شمار کیا ہے۔

عدل، تمام محاسن اعمال کی اصل ہے۔ جس انسان کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی کہ جو بات کرنی چاہیے انصاف کے ساتھ کرنی چاہیے، اس نے سب کچھ پا لیا۔ احسان سے یہاں مقصود حسن و عمل ہے۔ جو بات کرو' حسن و خوبی کی کرو۔ نیکی اور بھلائی کی کرو یعنی بنیاد عمل بھلائی ہو، برائی نہ ہو جو ہم سے قریب کا رشتہ رکھتے ہیں، وہ ہمارے حسن سلوک کے زیادہ حقدار ہیں، اس لیے ایتائی ذی القربیٰ کی رعایت بھی ضروری ہوئی۔ پھر فحشا، منکر اور بغی سے روک کر نواہی کے سارے مقاصد پورے کر دیے۔ فحش سے مقصود وہ برائیاں ہیں جو حد درجے کی برائیاں تسلیم کر لی گئی ہیں، منکر میں ہر طرح اور ہر قسم و درجہ کی برائیاں آ گئیں۔ بغی میں ہر طرح کی زیادتی آ گئی، خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں کی گئی ہو۔

جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو، جس سے ایسے اعمال ڈھلتے ہوں، جو ایسی زندگیاں بناتی ہو، اگر وہ ہدایت، رحمت اور بشارت نہیں تو اسے اور کس نام سے پکارا جا سکتا ہے؟

یہ بالکل درست ہے جس شخص کو نیکی، بدی اور اچھائی برائی کا کچھ بھی احساس و شعور ہو اور وہ دنیا کو بہتر سے بہتر حالت میں دیکھنے کا واقعی آرزو مند ہو، اسے ان باتوں سے ایک لمحے کے لیے بھی اختلاف نہیں

ہو سکتا۔ کیونکہ حقیقی اور پایدار فلاح کی راہ وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دے رہا ہے اور اس کا صحیح اندازہ ہر انسان کو محض تدبر و تفکر صحیح سے ہو سکتا ہے، اگرچہ وہ اسلام کا معتقد نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی تو نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ جس وجود اقدس کو اس تعلیم و دعوت کا اکمل و اتم پیکر بنا کر ہدایت عالم کے لیے مبعوث فرمایا گیا۔ اس کے "رحمۃ للعلمین" ہونے میں کسی کے لیے کیا گنجائش کلام باقی رہ سکتی؟ قرآن یقیناً "ذکرا للعلمین" ہے اور حضور ﷺ لاریب "رحمۃ للعلمین" ہیں۔

## عہد ماضی کے مناقشات

دنیا کا بڑا حصہ عہد ماضی کے مناقشات میں الجھا ہوا ہے۔ جھگڑے جاری ہیں، بحثوں کی گرم بازاری ہے حالانکہ جس دور پر سیکڑوں یا ہزاروں سال بیت چکے ان کے متعلق آج کوئی فیصلہ ہو بھی جائے تو گزشتہ حالات کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔

سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ایک مکالمے کا مختصر ساذکر ہے۔ فرعون نے سوال کیا کہ موسیٰ علیہ السلام! تمہارا پروردگار کون ہے؟ جواب ملا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کو اسکی خلقت بخشی، پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ کھول دی۔ فرعون کو خیال آیا کہ بے شمار گروہ گزر چکے ہیں۔ جو ایسے پروردگار کے معتقد نہ تھے۔ چنانچہ سوال کیا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہونا ہے، جو گزر چکے اور ایسے پروردگار کے تصور سے بھی ناآشنا تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ (طٰہٰ:۵۲)

"اس کا علم میرے پروردگار کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے۔"

یعنی اس کاوش میں پڑنے اور بحث و نزاع میں الجھنے سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟ بہتر ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں اور اپنی توجہ صرف ذاتی درستی پر جمادیں، کیونکہ نہ پہلوں کی گمراہیاں ہمیں کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان کی نیکیوں سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارا اچھا یا برا انجام ہمارے ہی اچھے یا برے اعمال کی بناؤ پر ہو گا، پھر کیوں انہی کی فکر نہ کریں؟ قرآن مجید نے یہی اصول دوسرے مقام پر ان الفاظ میں پیش کیا:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾ (بقرہ:۱۳۴)

"یہ ایک امت تھی، جو گزر چکی۔ اس کے لیے وہ تھا، جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لیے وہ ہو گا جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے، تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ان کے (یعنی گزری ہوئی قوموں اور جماعتوں کے)، اعمال کیسے تھے؟"

کتنا پاکیزہ اور امن پرور اصول ہے، جو ہمارے بے شمار جھگڑوں اور بحثوں کو ختم کر سکتا ہے۔ جب یہ مسلم ہے کہ نہ گزرے ہوئے لوگوں کی نیکیاں ہمارے بحثوں سے کم یا زیادہ ہو جائیں گی اور نہ ان کی بُرائیوں میں ہمارے جھگڑوں کی وجہ سے کوئی فرق پڑے گا۔ آخر ان بحثوں سے اس کے سوا کیا حاصل ہو سکتا کہ اپنا وقت بیجا صرف کریں، باہمی روابط کو بگاڑیں حالاں کہ ہماری یہ گرم جوشیاں نہ خود ہمارے نامہ اعمال میں کوئی اچھا اضافہ کرتی ہیں، نہ گزرے ہوئے لوگوں کے لیے کسی بھی درجے میں مفید و سود مند ہیں۔ اگر دنیا اس اصول کو اپنالے تو غور کیجیے کہ اس کی ناخوشگوار اور بے نتیجہ سرگرمیوں میں کتنی کمی آجائے اور تعاون و خوشگواری کی فضا کتنی اچھی ہو جائے؟

## بھائیوں کے درمیان مصالحت

قرآن مجید کا ایک اصول یہ ہے:

وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۝۹ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَ اَخَوَيۡكُمۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝۱۰ (حجرات: ۹۔۱۰)

"اور اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ پس اگر ان میں سے ایک زیادتی پر تلا رہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کا مرتکب ہو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پس اگر وہ لوٹ آئے تو دونوں فریقوں کے درمیان عدل کے مطابق صلح کرادو اور انصاف پر استوار رہو۔ یقیناً اللہ کو پسند آتے ہیں انصاف کرنے والے۔ مومن باہم بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

دیکھیے، قتل و خونریزی کو روکنے کی کتنی عمدہ، منصفانہ اور مؤثر عملی تدبیر ہے۔ ممکن ہے دو بھائیوں کے درمیان غلط فہمی کی بناء پر کشمکش کی نوبت آجائے تو اس صورت میں دوسرے بھائیوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح کرادیں۔ اگر کوئی فریق صلح سے انکار کرے یا زور و قوت کے بل پر دوسرے فریق کو پامال کر دینے پر تُل جائے تو سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کر مظلوم کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ظالم کو رُک جانے پر مجبور کر دیں۔ جب زیادتی کرنے والا بھی صلح پر آمادہ ہو جائے تو بیچ بچاؤ کرنے والوں کا فرض ہے کہ صلح کرادیں مگر وہ صلح عدل و انصاف کی بنا پر ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بعض لوگ قوی اور زبردست فریق کی کوئی بات اس بنا، پر قبول کرلیں کہ وہ زبردست ہے حالانکہ وہ بات عدل کے خلاف ہو۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم۔ عرض کیا گیا کہ مظلوم کی مدد تو کی جاسکتی ہے ظالم کی مدد کیونکر ہو گی؟ فرمایا: اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے روکو۔

یہ اصول مسلمانوں کے تعلق میں بیان ہُوا ہے، لیکن یہی اصول دنیا کے ہر بین الاقوامی ادارے کا ایک بنیادی اصول بن سکتا ہے اور جس حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے، انجمن اقوام متحدہ کا پورا نظام اسی پر قائم ہے، اگرچہ مختلف اقوام یا حکومتوں نے ذاتی اغراض کی وجہ سے اس پر عدل و انصاف کے ساتھ عملی پیرا ہونے کی صحیح صورت پیدا نہیں ہونے دی۔ ذاتی اغراض ہی کی آلودگی اب تک انجمن اقوام متحدہ کی کمزوری اور بے اثری کا باعث ثابت ہوئی ہے۔ قرآن مجید کے اس اصول سے جتنا انحراف کیا جائے گا یا اس پر عمل کی زیادہ سے زیادہ اچھی صورت اختیار کرنے میں جتنا تامل ہو گا، اتنا ہی امن عالم میں اختلال کا دروازہ کھلا رہے گا۔

## موجبات اختلال کا انسداد

پھر قرآن مجید نے قوموں کے خوشگوار تعلقات میں خلل ڈالنے والا ایک ایک رخنہ بند کیا۔ مثلاً:

۱۔ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ (حجرات: ۱۱)

"ہنسی نہ اڑائیں ایک قوم کے لوگ دوسری قوم کے لوگوں کی شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔"

۲۔ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (حجرات: ۱۱)

"عیب نہ لگاؤ ایک دوسرے کو۔"

۳۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۔ (حجرات: ۱۱)

"چڑانے کی غرض سے ایک دوسرے کے نام نہ رکھو۔"

۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (حجرات: ۱۲)

"اے ایمان والے لوگو! بہت بدگمانیوں سے اجتناب کرو، کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔"

۵۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝ (حجرات: ۶)

"اے ایمان والے لوگو! اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس خبر لائے تو (اسے صحیح سمجھنے سے پیشتر) تحقیق کرلیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ (خبر سنتے ہی) تم نادانی سے دوسری قوم پر جا پڑو۔ پھر کل اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔"

## آخری گذارش

یہ صرف چند اصول بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں، جن سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا زاویہ نگاہ عالمی اور بین الاقوامی ہے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی ادارہ ہائے امن و سلامتی کے بنیادی اصول بھی سامنے

آجاتے ہیں اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ ایسے اداروں کو زیادہ سے زیادہ مؤثر و کامیاب بنانے کے لیے کن کن اوصاف و خصائص کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ان اوصاف و خصائص کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کئے بغیر کوئی اجتماعی ادارہ خصوصًا بین الاقوامی ادارہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔

تمت بالخیر